ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
محلے کی دیوار
غلام الثقلین نقوی

رفیع الدین ہاشمی
۱۱؍نومبر ۱۹۷۵ء

لمحے کی دیوار

غلام ثقلین نقوی

ناشر
مکتبہ عالیہ، ایبک روڈ، لاہور

اشاعت اوّل: ۱۹۷۴ء

لمحے کی دیوار

ناشر : الطاف حسین

طابع : پنجاب آرٹ پریس

تعداد : پانچ سو

سرورق : حنیف سرور

کتابت : محمد اکرم انجم

قیمت

-/۶ روپے

چند ناگزیر حالات کی بنا پر یہ مجموعہ "شفق کے سائے" کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ حالانکہ تاریخی ترتیب میں اسے "بند گلی" کے بعد اور "شفق کے سائے" سے پہلے شائع ہونا چاہیے تھا۔ اس مجموعے کا مطالعہ کرتے وقت قارئین کرام براہ کرم یہ امر پیش نظر رکھیں کہ ان افسانوں کو مصنف کے فنی ارتقا میں درمیانی کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔ (غلام الثقلین نقوی)

ترتیب

مجتبیؔ
رفیق خاور

کے نام

پیش لفظ

غلام الثقلین نقوی اپنے نام کے بوجھل پن کے باوصف اردو ادب میں شعریت اور لطافت کا نمائندہ ہے۔ اس کی صنف اگر شاعری ہوتی تو یہ دونوں اوصاف شاید ایک عام قاری کی خصوصی توجہ نہ کھینچتے لیکن اس نے چونکہ نثری ادب کی صنف افسانہ کو ترسیل مطالب کا ذریعہ بنایا ہے اور اس صنف ادب میں شعریت اور لطافت کی دلآویز نقوش ترتیب دیئے ہیں۔ اس لئے قاری ان سے شدت سے متاثر ہوا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کا بوجھل نام اس کے ادبی تعارف میں حائل نہیں ہوا۔ اور وہ اپنے افسانوں کے دو مجموعوں "بندگی" اور "شفق کے سائے" کی اشاعت سے بہت عرصہ پہلے قبولیت عام کی کٹھن منزل کامیابی سے سر کر چکا تھا۔

تاہم میرے اس معروضے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نقوی نے افسانے کی اساس کو مجروح کرتے ہوئے اس دلکش کینوس کو محض نثر میں شعریت پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے یا اس کہانی کا پیٹرن Pattern بہت Loose ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نقوی کے پیش نظر بنیادی مقصد تو کہانی بیان کرنا ہی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ پلاٹ، کردار اور زمانے پر اپنی گرفت بڑی مضبوطی سے قائم رکھتا ہے قاری کو کہانی کی ابتدا سے انجام تک واقعات کے ایک منطقی سلسلے سے باخبر ہی نہیں کرتا بلکہ اسے ایک ایسے نقطے پر لا کر چھوڑ دیتا ہے۔ جہاں افسانہ نگار کا مشاہدہ

قاری کے گہرے تجسس کو بیدار کر دیتا ہے اور قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دریچے میں بیٹھی ہوئی وہ مغل صورت شہزادی جس کی ایک جھلک پانے کیلئے مذبذب قرار تھا (وہ لمحہ) یا وہ لڑکی جو ایک جیپ دکھلا کر ڈی۔ ایم نائز کی زندگی "کے گدلے پانی میں ہلچل مچا گئی" دگاؤں کا شہرہ یا گھنیرے سیاہ بادلوں کے نیچے چمکتی ہوئی گوری پیشانی جو بجلی بن کر کوندی تو "ہم سفر" کا "میں" خوابوں کی دنیا میں آوارہ ہو گیا۔ کون ہے ؟ افسانہ نگار اس سرکتے لمحے کو جو ایک دلکش شرارے کی طرح چمک کر غائب ہو جاتا ہے کیوں گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہے ؟

بات دراصل یہ ہے کہ متذکرہ لرزیدہ لمحہ ثقلین نقوی کی اپنی شخصیت کا اساسی جزو ہے۔ ہر چند شخصیت کا کوئی مرئی پیکر نہیں ہوتا کہ خطوں اور رنگوں کے حصار میں مقید کیا جا سکے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر بڑا فنکار اپنی تخلیقات کے تار و پود میں اس خوشبو کی طرح موجود ہوتا ہے جسے گرفت میں لینے کی بجائے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

عرصہ کی بات ہے کہ نواحِ سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں رومانی مزاج کے ایک مضطرب لڑکے نے ہوش سنبھالا۔ یہ گاؤں، شہر اور دیہات کی حدِ اتصال کے بالکل قریب واقع تھا۔ ایک طرف شہر کی چکا چوند اور دوسری طرف دیہات کی اونگھتی ہوئی نیم غنودہ فضا تھی ایک طرف شور اور ہنگامہ تھا اور دوسری طرف خاموشی اور سکون تھا۔ ایک طرف زندگی اپنے جملہ معیاروں میں ہر لمحہ تبدیلیاں لا رہی تھی اور دوسری طرف یکسر ٹھہراؤ، ثبات اور انجماد تھا۔ ایک طرف اقدار کا طلسم ٹوٹ رہا تھا اور زمانہ قیامت کی چال چل کر پرانی قدروں کو پامال اور نئی قدروں کو مروّج کر رہا تھا۔ دوسری طرف دائمی اقدار پر یقین محکم اس شکست و ریخت کا منہ چڑا رہا تھا۔ ان دو متضاد نہایتوں کے درمیان جب اس لڑکے کا بچپن بلوغت کی طرف روانہ ہوا تو وہ ایک ایسی فضا میں سے گزرا۔ جہاں قدم قدم پر قدیم اور جدید کا تصادم عمل میں آ رہا

تھا اور جب اس تصادم میں اس کی روح نے جسم پر فتح پائی تو وہ ایک ایسے فن کار کے روپ میں ظاہر ہوا۔ جو اپنے آپ کو ان دو انتہاؤں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی مفاہمت کے لئے آمادہ نہ کر سکا چنانچہ فن کار نقوی نے اپنی ایک الگ دنیا تخلیق کی اور اس تخیلی دنیا میں نقوی نے سماج کے روحانی تقاضوں کو ان کی بنیادی معنویت میں اس طرح قبول کیا کہ ان پر آلودگی کی کوئی گرد نظر نہیں آتی بلکہ یہ ایک ایسا جہان معنی ہے جہاں ہر طرف زندگی کی اساسی اقدار کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔

عملی زندگی میں اس قسم کی دنیا محض سراب نگر ہے اور شاید اسی لئے نقوی کے ہاں خواب سازی کا ایک ایسا مثبت اندازِ نگر ملتا ہے جو اسے مایوسی سے کبھی ہم کنار نہیں ہونے دیتا بلکہ اب تو صورت کچھ یوں ہے کہ شکست خواب بھی ایک طرح سے نقوی کا تعمیری رجحان بن چکا ہے اور وہ مسرت کے اس لمحے کا منتظر نظر آتا ہے جو مایوسی اور نامرادی کے اندھیروں میں قندیل نور بن کر چمکتا ہے اور ہمیشہ زندہ نظر آتا ہے۔ شاید یہ لمحہ وہ دیوار ہے جس کی پرلی طرف ثقلین نقوی کا جہان معنی آباد ہے اور جسے اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے وہ مسلسل الفاظ کا تیشہ چلا رہا ہے۔ نقوی کا ایقان ہے کہ جب یہ گریزپا لمحہ اس کی گرفت میں آجائے گا تو زمان و مکان کی تمام قیود لایعنی ہو جائیں گی اور وہ مثالی معاشرہ وجود میں آجائے گا۔ جسے پیدا کرنے کے لئے اس نے تخلیق کا فریضہ قبول کیا ہے۔

نقوی کے افسانوں میں لمحے کے آشوب کو کیوں بنیادی رجحان کی حیثیت حاصل ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

" آج میں نے محسوس کیا کہ دنیا کے نظام میں لمحے کو کتنا دخل ہے۔ اگر ایک لمحہ پہلے نظریں اٹھ جاتیں تو اس چہرے کی تمام رعنائیوں کا جائزہ لے لیتیں۔" (ہم سفر)

" اور رخسانہ کا جھکا ہوا سر تھوڑا سا بلند ہوا۔ حتیٰ کہ وہ آنکھیں نذیر کی آنکھوں سے جا ملیں۔ جن سے ایک لمحہ شرارے کی طرح پھوٹا تھا اور آنکھوں میں بجھی ہوئی راکھ تھی ،

غم و اندوہ کے سیاہ بادل تھے۔ جن کے پیچھے کسی ستارے کی ٹمٹماہٹ نہیں تھی ——
وہ 'لمحہ' مرچکا تھا۔"   (وہ لمحہ)

" اور پھر وقت کو پر لگ گئے۔ دن لمحے اور لمحے ثانیے بن گئے اور ثانیے ایک ایسی کسر اعشاریہ میں بدل گئے۔ جنہیں دماغ کی لطیف سے لطیف قوت بھی گرفت میں نہیں لاسکتی تھی۔ تین مہینے آنکھ جھپکنے سے پہلے گزر گئے۔ رنی کے ساتھ گزرے ہوئے تین لمحے۔ یہ تین لمحے جن کے دوران رنی پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ یہ تین لمحے جو اس کے حافظے کے خلاؤں میں رنی کی شمع بن گئے تھے۔ جن کی روشنی میں اس نے رنی کو پہلی بار دیکھا تھا اور پہچان لیا تھا۔"   (خدا حافظ)

غلام الثقلین نقوی کے افسانوں کا دوسرا اہم رجحان سفر کا ہے لیکن اس سفر کا مقصد کسی منزل کا حصول نہیں بلکہ یہ تجسس اور تلاش کے ذریعے زندگی کے فکری اور عملی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ اردو کے بعض افسانہ نگار تحرک پیدا کرنے کے لئے زندگی کی ساکن جھیل میں حادثے یا واقعے کا پتھر گرا کر کہانی کو آگے بڑھانے کی مصنوعی کوشش کرتے ہیں لیکن نقوی کی بیشتر کہانیوں میں یہ تحرک ماحول کی مدد سے حاصل کیا گیا ہے۔ ان کی چند اچھی کہانیوں مثلاً ہم سفر، وہ لمحہ اور کاغذی پیرہن میں بس، ریل یا گھوڑے پر سفر طے ہوتا ہے اور اس کے بیشتر کردار بھی ساکن ماحول کو چھوڑ کر لاشعور کے اسپ تازی پر سوار نظر آتے ہیں تاہم یہ حرکت اتنی تیز رفتار نہیں کہ باصرہ اطراف وجوانب میں پھیلی ہوئی زندگی کو گرفت میں ہی نہ لے سکے۔ میرا خیال ہے کہ نقوی شاید تیز رفتاری میں یقین ہی نہیں رکھتا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے کردار جب شہر کی فضا میں داخل ہوتے ہیں تو شہر کی تیز رفتاری کی تاب نہیں لا سکتے اور دیہات کی طرف دوبارہ آنے کے لئے بیقرار نظر آتے ہیں جہاں زندگی ازل سے ایک ہی سست رفتار سے چلی آرہی ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ نقوی کا سفر انسان کے باطن سے شروع ہوتا ہے

اسے موضوعی طور پر سوچنے اور دکھوں اور المیوں پر آنسو بہانے پر مائل کرتا ہے۔ یہ آنسو نہ صرف روح پر پڑی ہوئی کثافت کو دھو ڈالتے ہیں بلکہ انسان کے کھردرے جذبات کی تہذیب بھی کر ڈالتے ہیں۔ اور اسے رفعتِ احساس سے بھی ہمکنار کر دیتے ہیں۔

غلام الثقلین نقوی کے افسانوں میں سفر کے وسیلے سے ہجرت کا رجحان بھی نمایاں ہوا ہے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نقوی کی پرورش شہر اور دیہات کے نقطۂ انفصال پر ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے ربع سوم میں ہمارے ملک میں صنعتی ترقی کا جو دور آیا ہے، اس نے دیہات کے باشندوں کو شہر کی طرف زیادہ راغب کیا ہے۔ ہر چند اس رغبت میں حصولِ رزق کو زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن یہ حقیقت بھی مسلّم ہے کہ دیہات کے پاکیزہ ذہن نے شہر کی آلودہ فضا کا کچھ زیادہ گہرا اثر نہیں لیا۔ نقوی کی ہجرت کسی پیغمبر کی ہجرت نہیں کہ وہ نئی بستی کو الوہی پیغام پہنچا کر کسی بڑے ذہنی انقلاب کے لئے زمین ہموار کرتا۔ نقوی کی ہجرت تو ایک عام انسان کی ہجرت ہے جس کا مقصد جسمانی اور مادی ضرورتوں کی تکمیل اور روحانی سکون کی تلاش ہوتی ہے اور جس میں گناہ اور ثواب، خیر و شر کی آویزش میں الجھا ہوا انسان زندگی کی متضاد حقیقتوں میں سے فلاح کا کوئی راستہ تلاش کر رہا ہوتا ہے۔ میری رائے میں نقوی کا یہ رجحان شہر اور دیہات کے باہمی تضاد کو نمایاں کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا کردار جب دیہات کی طرف مراجعت کرتا ہے تو شدید ذہنی سکون سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ نقوی کو اگر مقصدی افسانہ نگار شمار کیا جائے تو مجھے دیہاتی اقدار کا فروغ اس کا بنیادی مقصد نظر آتا ہے اور اس نے شہری اقدار کی شکست و ریخت کے مقابلے میں دیہاتی اقدار کو زندہ اور فروغ پذیر دکھا کر اس مقصد کو پوری کامیابی سے حاصل کیا ہے۔

سفر کے رجحان نے ثقلین نقوی کو آنکھیں کھول کر چلنے پر آمادہ کیا ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو محدب بنا کر پیش کرنے کے انداز سے یہ بھی باور ہوتا ہے کہ اس کا باصرہ بے حد تیز ہے تاہم یہ حقیقت توجہ طلب ہے کہ نقوی کے ہاں زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال

کر دیکھنے کا رجحان نہیں ملتا بلکہ اس کے ہاں دزدیدہ نگاہی کا انداز زیادہ واضح ہے اور وہ اپنے معروض پر اکثر و بیشتر ٹیڑھے زاویئے سے نظر ڈالتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ زندگی کو دیکھنے کے لئے ہر شخص کا الگ الگ زاویہ ہوتا ہے۔ ثقلین نقوی چونکہ معروض کو مستقیم زاویے سے نہیں دیکھتا۔ اس لئے منظر کی پوری وسعت اور چہرے کے تمام خدوخال بعض اوقات اس کی گرفت میں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر اس کے افسانوں کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"اس نے ایک نظر زرینہ کو دیکھا لیکن یہ کم نگہی کی ایک اڑتی سی جھلک تھی جو ہموار سڑک پر پہنچتے پہنچتے چند دھچکوں میں یوں گھل مل گئی تھی کہ ایک بھرپور نظر کے قالب میں بھی ڈھل نہ سکی۔" (کاغذی پیراہن)

"اس نے رقیؔ کو کبھی آنکھ بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ سبق کے دوران اس کی نگاہیں تپائی پر گڑی رہتیں۔ جہاں کتابیں اور کاپیاں بکھری ہوتیں۔" (خدا حافظ)

ثقلین نقوی کے بیشتر معروف افسانوں میں دیہات کو پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے "گاؤں کا شاعر" اور "کاغذی پیراہن" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان افسانوں میں جہاں اس نے مقامی رنگ کی عکاسی بڑے فنکارانہ انداز میں کی ہے، وہاں اس کے ہاں دیہات ہمیشہ خیر کی علامت بن کر ابھرا ہے۔ ثقلین نقوی کا دیہات چونکہ مستقبل کے مثالی معاشرے کی علامت ہے، اس لیئے وہ اس کے مثبت پہلوؤں کو خود بھی باریک نظر سے دیکھتا ہے اور ان کی طرف قاری کی توجہ بھی منعطف کراتا ہے۔ اس کے افسانوں کے دیہات کو محسوس ہی نہیں کیا جا سکتا بلکہ چھوا بھی جا سکتا ہے۔ میری رائے میں غلام الثقلین نقوی کے فن کے دوسرے تمام محاسن نظر انداز بھی کر دیئے جائیں تو بھی اس کے فن کا صرف یہ ایک پہلو اسے اردو افسانے میں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

انور سدید

رانی واہ سیم کالونی سرگودھا

لمحے کی دیوار

افسانے

غلام الثقلین نقوی

میں سیالکوٹ سے جس بس پر سوار ہوا۔ وہ اتفاق سے خالی تھی۔ اس لئے مجھے فرنٹ سیٹ سے عین پیچھے کی سیٹ پر جگہ مل گئی۔

بس سیالکوٹ کے آباد ترین حصے کو عبور کرتے پیرس روڈ پر ہولی۔ پیرس روڈ کی ایک کوٹھی کے سامنے ڈرائیور نے بس کھڑی کر لی۔ اور ہارن دیا۔ کوٹھی سے ایک نوکر ایک نفیس سا اٹیچی کیس لے کر آیا۔ اور کلینر کے سپرد کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "فرنٹ سیٹ خالی ہے؟"

"خالی ہے۔" کلینر نے کہا۔ "سواری کہاں ہے"؟ نوکر نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر دوسرے لمحے بند کھڑکی کے باہر سے کسی نے پوچھا۔ "اٹیچی کیس رکھ دیا اندر؟" یہ کسی کوئل کی کوک تھی۔ کہ میرے کانوں میں نغموں کی شیرینیاں گھل گئیں۔ میں نے اپنی سیٹ کے برابر سے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ صرف ایک سفید چمکتی ہوئی پیشانی اور کوئل کے پروں کی طرح سیاہ بال دیکھ سکا۔

نہ معلوم اس سفید پیشانی، ان سیاہ زلفوں کے نیچے کیا تھا ——— جیسی جستجو میں

نرگسی آنکھیں، غنچہ سا منہ، گلاب کی پتیوں ایسے لال لال ہونٹ۔" میں نے سوچا اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان نرگسی آنکھوں کے نیچے ہونٹوں پر کالی مونچھیں ہوں جنہیں فانسے کی تہہ بھی نہ چھپا سکی ہو۔ میں اپنے خیال پر خود ہی اداس ہو گیا آج سے پہلے ایک بار مجھے مایوسی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ایک لمحہ پہلے میں نے رومان اور رنگینیوں کا ایک فردوسی محل تیار کیا تھا۔ اور دوسرے لمحے میری شومئے قسمت نے اس محل کے بھیانک کھنڈر دیکھ لئے تھے۔

"میں کہتی ہوں میرا اٹیچی اندر رکھ دیا؟" دوسرے لمحے کسی نے کہا۔ اور میرے تخیل کے افق پر اس گوری پیشانی اور سیاہ بالوں کی بھرپور نسوانیت پھر بجلی کا کوندا بن کر چمک گئی۔ میں پھر خوابوں کی دنیا میں آوارہ ہو گیا۔ اس بے داغ پیشانی کے نیچے دو نرگس کے پھول ہوں گے۔ جن کے گرد پلکوں کے گھنیرے سایوں کا حصار ہو گا۔ اور ان کی گھنی پلکوں میں تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز نگاہیں ہوں گی۔ اور وہ ہونٹ جن کے پتلے پتلے کناروں سے سرخیاں جھلک رہی ہوں گی۔ جیسے شراب بھرے جام سے۔ میرا خیال کتنا رنگین تھا۔

دروازہ کھلا۔ کھٹ سینڈل کی ایڑی کھڑکی۔

آج میں نے محسوس کیا کہ دنیا کے نظام میں لمحے کو کتنا دخل ہے۔ اگر ایک لمحہ پہلے میری نظریں اٹھ جاتیں تو اس کے چہرے کی تمام رعنائیوں کا جائزہ لے لیتیں۔ لیکن اب وہ سیٹ پر براجمان تھیں۔ چہرہ سامنے تھا۔ اور پشت میری طرف اور چمکیلے بالوں سے جن میں سردیوں کی ابر آلود راتوں کی تمام سیاہی جمع ہو گئی تھی۔ خوشبو کی بھینی بھینی لپٹیں آ رہی تھیں۔ کاش وہ ایک بار مڑ کے دیکھ لیں۔ صرف ایک بار۔ میں نے دل کو تسلی دی۔ کبھی تو یہ خواہش پوری ہو کر رہے گی۔ اگر اس لمحے نہ سہی، چند لمحے بعد سہی۔ دنیا امید پہ قائم ہے۔

میں نے وقت گزارنے کے لئے اپنے ساتھی مسافروں کا ایک مختصر جائزہ لیا۔ میرے ساتھ ایک نوجوان طالب علم تھے۔ ان کا کندھا میرے کندھے سے چھو رہا تھا۔ احساس کہہ رہا تھا کہ اس کندھے پر گوشت کی کمی تھی۔ ان کا رنگ گورا اور کپڑے میلے تھے۔ نظریں اُداس اُداس آوارہ سی، جیسے کسی کھوئے ہوئے نظارے کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ وہ ایک کتاب کا مطالعہ فرمانے کی بار بار کوشش کر رہے تھے۔ لیکن بھٹکی ہوئی نگاہیں کتاب سے دور بھاگ رہی تھیں۔ انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ چونک گئے اور انہوں نے کتاب بند کر دی اور میری طرف پریشان ہو کر دیکھنے لگے۔ پھر ان کی نظریں میری نگاہوں کے جال سے پھڑپھڑا کر نکل گئیں۔ اور شرما کر، لجا کر سردیوں کی ابر آلود کالی رات کے اندھیاروں میں بھٹک گئیں اور خوشبوؤں کے تانے بانے میں الجھ کر رہ گئیں۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے جیب سے پنسل نکالی۔ جس کا سکہ گھسا ہوا تھا اور اسے دانتوں میں داب کر کتاب کے ورق الٹنے لگے۔

ان سے پرے ایک نوجوان مولوی صاحب تھے۔ جن کے سر پر لنگی تھی۔ طرّہ اتنا بلند نہیں تھا کہ آسمان کی خبر لائے۔ شاید مقدار علم میں کچھ کمی تھی۔ داڑھی چھوٹی چھوٹی سیاہ اور بڑی نفاست سے ترچھی ہوئی تھی۔ مونچھیں طرے کی طرف اشارے کر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک محترمہ تھیں۔ سیاہ برقعے میں لپٹی لپٹائی مجسم بے کسی کا نمونہ بنی بیٹھی تھیں۔ مجھے اب اس مرحلے پر شرم سی محسوس ہوئی اور ڈر بھی لگا۔ میں نے گھبرا کر مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں شعلوں کی چمک تھی۔ نظریں حکم لگا رہی تھیں۔ "نامحرم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا جرم ہے۔"

"بسر و چشم۔" میں نے دل ہی دل میں کہا اور آنکھیں جھکا لیں۔ لیکن کن انکھیوں سے

مولوی صاحب کی نگاہوں کا تعاقب کرنے لگا ۔ جو جھجک جھجک کر بچتی بچاتی ، لاحول پڑھتی اُن زلفوں کی تاریکیوں میں کھوئی جا رہی تھیں۔ جہاں چشمہ آبِ حیات تھا ۔

میں مسکرایا ۔ میری مسکراہٹ برتی رد بن گئی ۔ کتاب والے نوجوان بڑے شرمیلے انداز میں تبسم فرما کر پھر کتاب میں کھو گئے ۔ مولوی صاحب جھینپ کر رہ گئے ۔ لیکن ..... وہ سیاہ برقعے والی خاتون شاید قہقہہ لگا کر ہنس دیتیں اگر حجاب اور نقاب مانع نہ ہوتے ۔ البتہ نقاب کی جالی میں سے ایک تیز سی چمک چھنتی ہوئی آ رہی تھی ۔ شاید یہ گھٹتے ہوئے قہقہے کی گھٹی ہوئی صدائے بازگشت تھی ۔

میرے دل میں پھر اس خواہش نے گدگدی کی ۔ کاش یہ چاند سی پیشانی ایک بار مڑ کے دیکھ لے ۔ کاش میرا رنگین خواب تشنہ تعبیر نہ رہے ۔ البتہ ایسے رنگین خواب کی تعبیر بھی کتنی رنگین ہوگی ۔

میں نے محسوس کیا کہ میری خواہش میں سبھی شریک تھے ۔ پنسل والے نوجوان کی نظریں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں ۔ " میں بہت غمگین ہوں ایک بار دیکھ لو تو اداسی کے بادلوں سے چاند چمک اٹھے ۔" مولوی صاحب شاید سوچ رہے تھے ۔ " اگرچہ نامحرم پر نظر ڈالنا گناہ ہے یا شاید گناہ کبیرہ ۔ لیکن قدرت کی صناعیوں کی ایک جھلک کتنی نشہ آور ہوتی ہے اور اس مقدس نشے سے محروم رہنا بھی تو کفرانِ نعمت ہے ۔"

میں نے دزدیدہ نگاہوں سے نقاب والی خاتون کا بھی پیغام حاصل کرنا چاہا ۔ نقاب کی جالی سے چھنتی ہوئی چمک لرز لرز کر کہہ رہی تھی ۔ افسوس میرا چہرہ برقعے کے پیچھے چھپا ہوا ہے ۔ یہ میرے ساتھی مولوی ہیں ۔ انہیں تم میرا بھائی سمجھ لو یا خاوند ، پردے کے بہت حامی ہیں ۔ ورنہ اگر میں نقاب الٹ دوں تو بجلیاں کوند جائیں ۔ قیامت برپا ہو جائے ۔ میری پیشانی بھی چاند کی کرنوں کی بنی ہوئی ہے ۔ میرے بالوں میں بھی شب دیجور کی سیاہی ہے ۔ میری آنکھیں بھی نرگسی ہیں لیکن مجبور ہوں ۔ نقاب کیسے الٹوں .....

نہیں اٹ سکتی ۔" اور مرمریں انگلی کا ایک مخروطی کونہ نقاب سے برآمد ہوا۔ ناخن حنا آلود تھا ۔ یہ انگلی بغاوت پر آمادہ ہوئی ۔ میں نے گھبرا کر دل ہی دل میں کہا۔ "مانتا ہوں بھئی ! آپ بجلی کی چمک ہیں ۔ قیامت کا غضب ہیں ۔ اس انگلی کو چھپا لیجئے ۔ مولوی صاحب دیکھ لیں گے تو قیامت برپا ہو جائے گی ۔ اور وہ انگلی پھر برقعے کی سلوٹوں میں غائب ہو گئی ۔

بس سٹارٹ ہوئی .... گھرر..... گھرر..... گھرر..... ڈرائیور دھیمے سروں میں کچھ گنگنانے لگا ۔ میں گانے کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا ۔ کچھ ایسا دلبیا گانا تھا ۔

" جیا بے قرار ہے ۔ چھائی بہار ہے آجا مورے بالما...."

رفتار کی سوئی صفر سے تھوڑا سا ہلی اور پانچ کے ہندسے پر پہنچ کر پھر لوٹ آئی ۔ بس چند گز چلنے کے بعد دوبارہ ٹھہر گئی تھی ۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا ۔ ایک اور سواری" تیز تیز آ رہی تھی ۔ ڈرائیور نے دور ہی سے پکار کر کہا ۔" ادھر اس طرف ہنٹ سیٹ پر"۔ اور فرنٹ سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی ایک انگلی ساٹن کی سفید شلوار کی کسی ریشمی سلوٹ سے چھو گئی ۔ اس کے چہرے پر وجدانی کیفیت لہرائی اور زبان ہونٹوں پر اس طرح پھیری جیسے شہد چاٹ رہی ہو ۔

نئی سواری ایک سانولی سی خاتون تھی ۔ جسم مائل بر فربہی تھا ۔ سر سے دوپٹہ اتر کر گلے میں پڑا ہوا تھا ۔ بال خشک ، بکھرے ہوئے اور مجبور سے تھے ۔ انہوں نے اندر قدم رکھتے ہی چیخ کر کہا " ہیلو " گوری پیشانی والی لڑکی ایک کونے میں دبک گئی ۔ سانولی خاتون بیٹھتے ہی مڑ مڑ کر بس کا معائنہ کرنے لگیں ۔ ان کی نگاہوں میں بلا کی تیزی تھی میرے تو دماغ میں جیسے گھسی جا رہی تھیں ۔ جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں میں نے دل ہی دل میں کہا ۔ " کیا ہی اچھا ہو اگر آپ بیٹھ میری طرف موڑ لیں: میرے

ساتھی طالب علم کتاب بند کر کے نا معلوم کیوں مسکرائے ۔ ان کی مسکراہٹ چند لمحوں کے لئے ان کے ہونٹوں پر منجمد ہو کر رہ گئی ۔ مولوی صاحب بے خیالی کے عالم میں اپنی بیوی ۔۔۔ یا بہن کے برقعے کی ایک شکن سے کھیل رہے تھے اور برقعہ پوش خاتون چھوئی موئی کی طرح سمٹی جا رہی تھیں ۔

بس پھر سٹارٹ ہوئی ۔ گھرر ۔۔۔ گھرر ۔۔۔ سوئی ڈائل پر گھومی اور پھر تیس کے ہندسے پر جا کر تھرتھرانے لگی ۔ ہوا میں تیزی آ گئی ۔ ہوا کے جھونکے عموماً گستاخ ہوتے ہیں ۔ چنانچہ معمول کے مطابق وہ ان کے بالوں کے ساتھ بھی گستاخیاں کرنے لگے جن میں شب تاریک کے اندھیرے لرز رہے تھے اور ان سے بھی جن میں چاندنی رات کے ملتے ہوئے اجالے اور سائے تھے کبھی پٹرول کی بو کے بھبکے آتے اور کبھی دھیمی سی خوشبو کے ہلکے ہلکے سانس ۔۔۔

" نسیم کہاں جا رہی ہو ؟" سانولی پیشانی والی خاتون نے کڑک کر کہا ۔ مولوی صاحب نسیم کا نام سن کر نجانے کیوں چونک گئے ۔ لیکن صاف برقعے کی سلوٹوں میں ارتعاش پیدا ہوا اور پھر نقاب کے ایک کونے سے ایک حنائی انگلی جھجکتی جھجکتی برآمد ہوئی ۔ اس انگلی پر طلائی انگوٹھی تھی جس پر شوخ چمکیلے رنگ میں " ن " کا حرف کندہ تھا ۔ نازلی ، نزہت ، ناہید ۔ بھئی بہت سیانی ہیں آپ آپ کا نام بھی نسیم ہے ۔ خوب ۔ کتنا دلفریب نام ہے ، کتنا میٹھا ، کتنا پیارا ، کتنا رومان پرور ، شام و سحر کی نغمگیوں کا حامل ۔

" لاہور جا رہی ہوں ایس ! " نسیم نے دھیمے سے کہا ۔

" لاہور ۔ کس کے پاس ؟" ایس نے پوچھا ۔

" آپا سعیدہ کے پاس "۔

" یونہی "۔

" وہاں رہ کر امتحان کی تیاری کروں گی ۔ ابھی دو ماہ باقی ہیں ۔ ابس وغیرہ کیا

تیاری کر رہی ہوں ۔ پچھلے سال فیل ہو گئی تھی نا" نسیم نے جواب دیا ۔ میرے ساتھی نوجوان طالب علم کی چھاتی ابھری ۔ لگا ہوں میں ایک اداس فخریہ جھلک پیدا ہوئی ۔ ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ کی کمزور سی لہر ناچی "میں آج تک کبھی امتحان میں فیل نہیں ہوا ۔ اس سال بی ۔ اے کا امتحان دے رہا ہوں ۔ فسٹ ڈویژن میں پاس نہ ہوا تو کیا سمجھیں گی آپ" نسیم سے مقابلہ تھا نا! اور وہ آج تک تعلیم کے میدان میں کبھی ہیٹے نہ نکلے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا رنگ زرد تھا ۔ کپڑے میلے اور پنسل کا سکہ گھسا ہوا تھا ۔ لیکن ظالم وستم شعار نسیم نے مڑ کر اس چیلنج کو سمجھنے کی کوشش نہ کی ۔ ان کی آنکھوں میں پھر سے اداسی کے بادل گھر آئے ۔ ۔

"اور تم کہاں جا رہی ہو ایلس؟" نسیم نے پوچھا ۔

"لاہور" ایلس نے جواب دیا ۔

"لاہور کیوں؟"

"تم جانتی ہی ہو ۔ میں نے پچھلے سال بی ۔ ٹی کر لیا تھا نا! لاہور کے ایک سکول میں پڑھاتی ہوں ۔ اتوار کی چھٹی گزار کر واپس جا رہی ہوں ۔ بی اے پاس کرنے کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے" ایلس نے کہا ۔

"میں ابھی تک کچھ بھی سوچ نہیں سکی ۔ تم ہی بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

"شادی کر لو ۔ ایلس نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا ۔ ایلس کتنی منہ پھٹ تھیں ۔ نسیم شرما گئی ہوں گی ۔ مجھے نامعلوم غصہ آ گیا ؟ مولوی صاحب کا نچلا لب لٹک گیا ۔ وہ بہت حیران ہو رہے تھے ۔ کتاب والے نوجوان نے کھٹ سے کتاب بند کر دی ۔

اب ایلس اور نسیم دونوں سیٹ پر تھوڑا سا گھوم گئیں ۔ نسیم کا بایاں اور مس ایلس کا دایاں رخسار میرے سامنے تھا ۔ ایک رخسار سحر کا اجالا تھا دوسرا اطیبالی شام کا لیک

تھا — ایک آنکھ میں شراب ارغوانی کی جھلک تھی۔ کیف پرور اور کیف انگیز — دوسری آنکھ میں ٹوٹے ہوئے خمار کی سی کیفیت تھی۔

مولوی صاحب جو بدستور حیران تھے کہنی گھٹنوں پر ٹکا کر اور ہتھیلی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر آگے کی طرف جھک گئے کہ دیکھیں کب یہ ہونٹ کھلتے ہیں اور کب نغمات کی بارش ہوتی ہے وہ ہونٹ جن کا ایک سرخ کنارہ نظر آ رہا تھا۔ جس سے نیلی نیلی رگیں شروع ہو کر رخسار کی سرخیوں میں دوڑ رہی تھیں۔ اور بس کھلی سڑک پر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ سڑک کے دو رویہ سبز درخت اور کھیت بھی۔ وہ درخت جن کی جھاڑیوں کو سنہری دھوپ چوم رہی تھی۔

پھر ایلس نے معمول کے خلاف کوئی سرگوشی کی اور نسیم نے ہمہ تن متوجہ ہو کر کہا۔

"کون نزہت۔"

"بھول گئیں، وہی شریر چلبلی سی لڑکی۔ تمہاری ہم جماعت تو تھی بیچاری۔"

"تو اس کی شادی ہو گئی؟"

"شادی؟" ہوں۔ وہ تو ایک لڑکے کی ماں بھی بن چکی ہے۔"

"لڑکا؟" نسیم نے نہایت پیارے پیارے حیرانی کا اظہار کیا۔ نیلی نیلی رگیں کانپ اٹھیں۔

"اسے پچھلے سال محض شادی کے لئے کالج چھوڑنا پڑا۔" ایلس رک کر نسیم کا چہرہ غور سے دیکھنے لگیں۔ جہاں سرخیوں کا سیلاب آہستہ آہستہ امنڈتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ "سال کے اندر اندر گود ہری ہو گئی۔" ایلس نے مسکرا کر کہا اور سانولی مسکراہٹ لبوں کے گوشے میں آ کر دیر تک کھلتی رہی۔

نسیم نجانے کس خیال کی گہرائیوں میں کھو گئیں۔ ایلس نسیم کے سوچتے ہوئے چہرے اور بھینچے ہوئے ہونٹوں کو غور سے تک رہی تھیں۔ نسیم کی گھنی پلکیں کبھی گرتی تھیں اور کبھی

اٹھتی تھیں ۔جیسے ایلس کی بے باک نظروں سے بچ رہی ہوں ۔

گھرر.... گھرر.... گھرر ــــ اور پچھلی سیٹ پر بھانت بھانت کی بولیاں جاری تھیں ۔ کوئی صاحب حکومت کی طرف سے عائد کردہ ٹیکسوں کی بھرمار کا رونا رو رہے تھے ۔ یونہی بے مزا سا غل مچا رہے تھے ۔ میں نے مڑ کر انہیں دیکھا ۔لباس اور وضع قطع صاف بتا رہے تھے کہ چور بازاری تاجر ہیں ۔ان کے سامنے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی جو شکل صورت سے گھسے ہوئے کلرک معلوم ہوتے تھے ، یونہی مسکرائے جا رہے تھے ۔ "دولت کتنی بری چیز ہے ۔اس چور بازاری سیٹھ کو دیکھو ۔روپیہ پیسہ اس کے اعصاب پر کیسے سوار ہے ۔ اس کے پاس سونے چاندی کے ڈھیر ہوں گے پھر بھی حکومت کا گلہ کر رہا ہے ۔میرے پاس بھی ایک دولت ہے جسے علم کہتے ہیں جو کم ہوتا ہے ۔ نہ اُسے چور چرا سکتا ہے ۔نہ اُسے حکومت کے ٹیکس کا ڈر ہے ۔ اور علم قناعت سکھاتا ہے ۔میرے تین بچے بھوکے ہوں ، ننگے رہیں ، میں نے کبھی شکایت نہیں کی ۔میرے پاس علم کی دولت ہے جو قناعت سکھاتی ہے "... اور جلد ہی وہ اپنے خیالات پر کھسیانے سے ہو کر انگلی دانتوں میں لے کر دبانے لگے جس کے پوروں پر سیاہی کے دھبے تھے اور اس سے پرے...

"آج کل نزہت کہاں ہے ؟" نسیم کی نقرئی آواز روح کی نالیوں کو نکھرا سی گئی ۔

"لاہور میں...... میں اُس سے کئی بار مل چکی ہوں "۔ ایلس نے کہا ۔

"میں اُس سے ملنا چاہتی ہوں ۔تمہیں پتہ تو یاد ہو گا " نسیم نے پوچھا ۔

"کچھ بیمار سی ہے ، ضرور مزاج پرسی کے لئے جاؤ "

"بیمار سی ہے " نسیم نے حیران ہو کر کہا ۔

"بہت کمزور ہو گئی ہے ۔چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا ہے ۔سمجھ لو ایک سوکھی کلی

کی طرح پژمردہ ہو کر رہ گئی ہے ۔"

"سو کھی کلی کی طرح ..... بیچاری کی سب شوخیاں چھن گئی ہوں گی کالج کے زمانے میں کتنی چنچل تھی ۔ اس کی شرارتیں کتنی بھلی لگتی تھیں ۔" نسیم نے سنجیدہ لہجے میں کہا ۔

"ان دنوں وہ لڑکی تھی نا ..... اب عورت بن چکی ہے ۔" ایلس نے نہ جانے کیوں یہ فقرہ اتنی اونچی آواز میں شوخی کے ساتھ ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ۔

"عورت بن کر سب شوخیاں چھن جاتی ہیں کیا ؟" نسیم نے نہایت بھولپن سے پوچھا ۔ ایلس معمول کے خلاف خاموش رہیں ۔ اور پھر نسیم خود ہی بول اٹھی "عورت تو ہر ایک کو بننا پڑتا ہے ۔" ایلس جواب میں بڑی سنجیدگی سے مسکرائیں ۔ وہ مسکراہٹ جو ان کے ہونٹوں کے ایک کونے سے ایک اداس سی آرزو بن کر ٹپک گئی ....

اے کاش ! مجھے بھی کوئی عورت سمجھ لیتا ! .

گھرر ..... گھرر ..... گھرر ۔ بس اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی ۔ ایلس خاموش تھیں ۔ بس کے پچھلے حصے میں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ۔

نسیم نے گھبرا کر کہا "ایلس گم سم سی بیٹھی ہو ۔ کوئی بات کرو ۔"

"تم ہی کیے جاؤ نا ! بڑی دانائی کی باتیں کر رہی تھیں ۔" ایلس کھوئے کھوئے انداز میں بولیں ۔ نسیم جھینپ کر خاموش ہو کر رہ گئیں ۔

پھر گہری خاموشی طاری ہو گئی ۔ اگرچہ بس اپنے سفر پہ تیزی سے رواں دواں تھی ۔ میں ہمہ تن متوجہ تھا ۔ مجھے توجہ دینے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا ۔ میں نسیم اور ایلس کی پرائیویٹ گفتگو میں خواہ مخواہ دخل انداز ہو رہا تھا ۔ مجھے کچھ شرم سی محسوس ہوئی ۔ لیکن دوسرے لمحے شرم کا احساس جاتا رہا ۔ میں نجانے کیوں ان بھولوں

سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جو نسیم کے سرخ ہونٹوں سے جھڑ رہے تھے لیکن اب
نسیم خاموش تھیں۔ یکایک مجھے اپنے جسم کے ایک ایک روئیں میں سوئیاں سی چبھتی
محسوس ہوئیں۔ مس ایلس کی پھر نظرِ عنایت تھی۔ یہ تیر انہیں نگاہوں سے پھینکے جا رہے
تھے۔ میں نظریں جھکائے چپ چاپ تیروں کی بارش تلے بیٹھا رہا۔ اور چند لمحوں کے بعد وہ
نگاہیں نسیم کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

اور نسیم کے ہونٹوں سے سرخ پھول جھڑے لیکن میرا دامن خالی رہا۔ نسیم سرگوشی
کے انداز میں بول رہی تھیں۔ ایلس خاموش تھیں۔ میں نسیم کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہ
سن سکا۔ مجھے اپنی کمزور قوتِ سماعت پر غصہ آیا۔ مجھے ڈرائیور پر غصہ آیا۔ جس کا
انجن اتنا شور پیدا کر رہا تھا۔ اور مجھے بس کے پچھلے حصے میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر
غصہ آیا جن کی باتیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ بن گئی تھیں۔ اور مجھے سب سے زیادہ
ایلس پر غصہ آیا۔ جنہوں نے پر اسرار خاموشی اختیار کر لی تھی اور اس قدر تشنہ بنتی
چلی جا رہی تھیں نسیم باتیں کرتی کرتی سرخ ہوتی جا رہی ہیں۔ شوق کی آگ
بھڑک کر تیز ہوتی جا رہی ہے۔ اور آپ خاموش ہیں۔ مس ایلس کب تک خاموش
رہیں گی آپ؟

لیکن مس ایلس ایک مدت تک خاموش رہیں اور یہ خاموشی مجھ پر بوجھل چٹان
بن کر رہ گئی۔ نہ معلوم کتنے زمانوں کے بعد میں نے پھر مینا کی قلقل اور کوثر و تسنیم
کی لہروں کی جھنکار سنی۔ نسیم نے پھر کوئی سرگوشی کی تھی۔ میں پھر ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔
اور مجھے پھر جسم کے روئیں روئیں میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہوئیں۔ ایلس پھر پچھلی سیٹ
کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میرے ساتھی نوجوان طالب علم جھینپ کر میلے پائجامے کے
ایک حصے کو بنظرِ غائر دیکھنے لگے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایلس مطمئن سی
ہو گئیں۔ جیسے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے یہ دو بدحواس نگاہوں کی تاب نہ لا

گرہ ضعیا تو ہو گئے ہوں۔ اور اب ان میں سننے اور پوچھنے کی ذرا سی حس بھی باقی نہ رہی ہو۔ پھر ایلس کھلیں اور خوب کھلیں " ماموں نادِ بھائی ہے نا..... تم نے اُسے دیکھا ہو گا..... وہ چھ فٹ لمبا تڑنگا سا پہلوان قسم کا آدمی ہے "

"خوب.... تو اُس سے شادی ہو گئی بیچاری کی.... وہ اونٹ سے...."

" نزہت کہا کرتی تھی کہ وہ اس کی ناک کی نکیل بنے گی "

تسنیم کا دل چاہا کہ وہ کھلکھلا کر ہنس دے لیکن دبی دبی ہنسی کی لہر ہونٹوں کے گوشے تک آکر رہ گئی تسنیم کو نزہت کی کوئی شرارت یاد آگئی ہو گی۔ نزہت کتنی شریر تھی۔ اور اب وہ کسی کی ناک کی نکیل بن چکی تھی یا اُس کی ناک میں کسی نے نکیل ڈالی تھی اور اب اس کی شوخیاں چھن چکی تھیں۔ اب اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اور وہ بیمار سی ہے زرد زرد..... سوکھی کلی کی طرح مرجھائی ہوئی عورت ہر ایک کو بننا پڑتا ہے۔ اور عورت بن کر سب رنگینیاں چھن جاتی ہیں۔ اور نزہت تو چینی کے کھلونے کی طرح نازک تھی۔ چینی کا کھلونا جسے ایک موٹے تازے بچے کے ہاتھوں میں تھما دیا ہو۔ ایسا کھلونا بھلا کے دن چل سکتا ہے۔ آخر ایک دن ٹوٹ جائے گا۔ ریزہ ریزہ ہو جائے گا تسنیم سوچتے سوچتے مخمور ہوتی جا رہی تھیں۔ اس شرابی کی طرح جسے شراب کا تصور ہی مخمور بنا دینے کے لئے کافی ہو۔ رخسار کی شفاف سرخیوں تلے نیلی نیلی رگیں کانپ رہی تھیں اور ہونٹوں کے گوشے میں شرم و حیا کے دلآویز خم پیدا ہو گئے تھے اور ایلس بھی سوچ کے گہرے سمندر میں غرق تھیں۔ عام طور پر وہی کھلونے ٹوٹتے ہیں۔ ریزہ ریزہ ہوتے ہیں۔ جو نازک ہوں۔ خوبصورت ہوں۔ دلپسند ہوں۔ اور لوہے کے لیے ڈھلے کھلونے؟ انہیں کون توڑ سکتا ہے بھلا..... انہیں توڑنے پھوڑنے کو جی کس کا چاہتا ہے بھلا.... اور ایلس سوچتے سوچتے اداس

ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اور اداسی ان کے لبوں کے سانولے گوشے میں لرز رہی تھی۔ بڑی سنجیدگی اور انتہائی بے بسی کے ساتھ میرے ساتھی نوجوان طالب علم کتاب میں غرق ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور مولوی صاحب اپنی بیوی یا بہن کے برقعے کی ایک ریشمی شکن سے کھیلتے اور لپٹے جا رہے تھے۔

گھرر.... گھرر.... گھرر — بس اپنے سفر پر رواں دواں تھی۔

چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی اور پھر ایلس نے یکایک بیدار ہو کر کہا۔ "تمہارا بی۔ اے کے بعد کیا ارادہ ہے نسیم!" نسیم نے چونک کر دھیمے سے کچھ جواب دیا۔ اور مجھے افسوس ہوا۔ میرا دامن پھر خالی رہا۔ ایلس اچانک شوخ ہو کر چہکیں "میں جانتی ہوں تم بی۔ اے کے بعد کیا کرو گی۔" "کیا؟" نسیم نے پوچھا۔ "یہی نا کہ کوئی اچھا سا شکار ڈھونڈ لو گی۔ تم جیسی خوبصورت لڑکیوں کی تقدیر میں یہی لکھا ہوتا ہے" اور ایلس کے اندر قہقہوں کا دبا ہوا لاوا پھوٹ نکلا۔ نسیم نے متوحش نظروں سے ایلس کو دیکھا اور پھر اس کا بازو دباتے ہوئے کہا "ایلس!...." نسیم نے کوئی سرگوشی کی ہے اور ایلس خاموش ہو گئیں۔ نسیم نے یہی کہا ہوگا۔ کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لوگ بہرے اور بدھو نہیں۔ ایلس نے مڑ کر ہم پر پھر تیروں کی بارش کر دی۔ اور اس دفعہ میں نے بھی محسوس کیا کہ میرے حواس آہستہ آہستہ ماؤف ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ایلس چند لمحے اور ہمیں اس طرح دیکھتی رہیں تو کم از کم میں لاشعور کی مدہوش وادیوں سے مدت تک نہ لوٹ سکوں گا۔ لیکن ایلس جلد ہی مطمئن سی ہو کر نسیم کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ان کے نزدیک ہم بہرے اور بدھو بن چکے تھے۔

"میں نے اُسے انارکلی میں دیکھا" ایلس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"کسے؟ نزہت کو؟" نسیم نے پوچھا۔

"نہیں وہی شاعر سا ......" ایلس نے کہا۔

"کونسا شاعر؟" نسیم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پریشان حال، کھوئی کھوئی نگاہیں جیسے اس نے انارکلی میں کچھ گم کر دیا ہو۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"اس نے مجھے دیکھا اور میرے پاس سے گزر گیا" ایلس کے لہجے میں انتہائی تاسف تھا۔

"معلوم ہیں باتیں کر رہی ہو؟" نسیم نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"نجانے مجھے اس کی بے نیازی کا اتنا افسوس کیوں ہوا۔ اس نے مجھے پہچانا تک بھی نہیں۔ یونہی پاس سے گزر گیا" ایلس نے آنکھیں بند کر لیں اور نسیم حیران ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔ یہ شاعر سا کون تھا۔ پریشان بالوں اور کھوئی کھوئی نگاہوں والا سڑی انسان جس نے ایلس کو ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اور ہوا کے اس جھونکے کی طرح پاس سے گزر گیا۔ جو محسوس بھی نہیں ہو سکتا۔

"آخر کالج کا ساتھی تھا۔ دو سال اکٹھے گزرے تھے۔ مدت کے بعد ملے تھے۔ کم از کم پہچان کر ذرا مسکرا تو دیتا۔ یہ شاعر لوگ اپنی دھن میں اس قدر مست کیوں رہتے ہیں؟" ایلس نے پوچھا۔ نسیم بھلا کیا جواب دیتیں؟ "اس نے کالج کے ایک مشاعرے میں غزل پڑھی تھی اور سارے مجمع پر چھا گیا تھا۔ کتنا سریلا ترنم تھا۔ تمہیں یاد نہیں آ رہا نسیم؟"

"جمیل سرشار کی بات کر رہی ہو ایلس؟"

ایلس نے سر ہلا دیا۔ نسیم نے ایلس کا بازو ہلکے سے دبایا۔ ایلس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"تم یکایک اداس کیوں ہو گئی ہو ایلس؟"

"ہیں.... نہیں تو.... کون کہتا ہے ..... یونہی...!" اور ایلس کے اندر سے پھر وہی قہقہے ابل پڑے۔ وہ خشک کھوکھلے قہقہے، اداس اکنگین اور درد میں ڈوبے ہوئے قہقہے۔ نسیم کچھ مدت حیران رہیں۔ پھر انہوں نے ایلس کا بازو زور سے دبا کر آہستہ آہستہ سے کچھ کہا۔ اور قہقہوں کا طوفان یکدم رک گیا۔ لیکن اب کے ایلس نے پچھلی سیٹ کی طرف نہ دیکھا۔

"میں بھی کس قدر جذباتی ہوں۔ میں بھول ہی گئی تھی کہ میں لاری میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ لیکن نسیم اگر تمہارے پاس سے بھی کوئی اس طرح سے گزر جائے تو تم اپنی ہتک محسوس نہیں کرو گی؟"

"نہیں ایلس!" اور ایلس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "سچ" اور حیرت غصے کی جھلک گئی۔ "نسیم یہ بہت بڑی ہتک ہے۔ اس کو کیا حق حاصل تھا کہ وہ یوں میرے پاس سے گزر جاتا۔ جیسے میں راستے میں گرا ہوا خشک پتہ تھی جس کی ہستی سے بے نیاز ہو کر لوگ اسے روندتے چلے جاتے ہیں۔"

"اس نے تمہیں پہچانا نہیں ہوگا ایلس۔"

"شاید.... ایک بات پوچھوں نسیم؟" نسیم نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔

"اگر انارکلی کے بازار میں تمہیں وہی شاعر کیا نام ہے اس کا مل جائے۔ تو کیا تمہیں پہچانے بغیر پاس سے گزر جائے گا؟"

"میں کیا جانوں" نسیم نے ذرا بوکھلا کر کہا۔

"نہیں نسیم تم جان بوجھ کر سچ بولنا نہیں چاہتیں۔ تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ وہ تمہیں دیکھ کر ایسی بے نیازی نہ برت سکتا۔ وہ تم سے بات کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتا۔ وہ تمہیں متوجہ کرنے کے لئے کھنکھارتا۔ وہ کوئی نہ

کوئی موقع پیدا کر لیتا اور تم سے کہتا "معاف کیجئے!" اور اگر تم متوجہ نہ ہوتیں تو وہ مسکرا کر کہتا "میرا خیال ہے کہ ہم . . . . . ." اور اگر تم پھر بھی اس کی بات پر دھیان نہ دیتیں تو وہ مایوس ہو کر اپنا جملہ پورا نہ کر سکتا۔ لیکن اس موقعے کی تاک میں رہتا کہ تمہارے ہاتھوں سے اچانک رومال گر جائے اور وہ اٹھا کر تمہیں دے دے۔ تم کاؤنٹر پر اپنا پرس بھول جاؤ۔ اور وہ تمہارے پیچھے بھاگ کر جائے اور کہے "مس نسیم یہ آپ کا پرس" اور تم دھیرے سے کہیں "تھینک یو۔"

"ایلس کیسی باتیں کر رہی ہو!" نسیم کے لہجے میں تھوڑا سا احتجاج اور تھوڑی سی خوشی تھی لیکن ایلس اپنی رو میں بہتی چلی گئی۔ "اور اگر اسے یہ سنہری موقعے میسر نہ آسکتے تو وہ پالتو کتے کی طرح تمہارا پیچھا کرتا۔ ایک دکان سے دوسری دکان تک، ایک بازار سے دوسرے بازار تک حتیٰ کہ تم اس کی ہستی اور اس کے ارادے سے بے خبر ہو جاتیں۔ اور اسے نظروں ہی نظروں میں دھتکارنے پر مجبور ہو جاتیں۔"

"ایسا نہ کہو ایلس!" نسیم نے سٹپٹا کر اونچی آواز میں کہا۔

"پھر بھی وہ ہکلاتے ہوئے کہتا مس نسیم! میرا خیال ہے کہ ہم فلاں سال دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ آپ نے فلاں جلسے میں مضمون پڑھا تھا۔ میں نے اپنی ایک غزل ترنم سے پڑھ کر سنائی تھی۔ اور تم اسے پہچان جاتیں۔ شاید تھوڑا سا مسکرا بھی دیتیں اور وہ کیف و سرور کی وادیوں میں بھٹک جاتا۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر تمہاری آنکھوں کی تعریف کرتا۔ تمہاری مسکراہٹ کے گن گاتا۔ تمہارے بالوں میں رات کے اندھیروں کی تلاش کرتا!"

"ایلس! ایلس!" نسیم نے چیخ کر کہا! "میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔"

"وہ تم سے بے نیازی نہ برت سکتا۔ وہ تمہاری ہتک نہ کر سکتا نسیم۔" ایلس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ اسے ایسی جرأت کہاں ہو سکتی تھی۔ لیکن

اس نے میری ہتک کی ۔ میرے پاس سے یوں گزر گیا ۔ جیسے میں پتھر کا بے حس بت تھی ۔ جس پر اناڑی سنگ تراش نے مشقِ ستم کر کے گلی میں پھینک دیا ہو۔"

"ایلس! یہ کیا قصہ لے بیٹھی ہو۔ کوئی اور بات کرو" نسیم نے ہمدردانہ انداز میں کہا " وہ تمہیں پہچان نہ سکا ہوگا۔"

ایلس خاموش ہو گئیں ۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا ۔ ایلس کی پلکیں نم آلود تھیں۔ میں نے اپنے جسم میں ایک کپکپی سی محسوس کی ۔ میرے اندر ہمدردی اور محبت کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ ایلس کو پہلی بار دیکھ کر نفرت کی وہ چنگاری، جو میرے سینے میں پیدا ہوئی تھی ۔ یکایک سرد پڑ گئی ۔ مجھے یکایک محسوس ہوا کہ ایلس نفرت کے قابل نہیں تھیں ۔

ایلس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ اب ایلس کی نگاہوں کے تیر ان کی پلکوں کی طرح نم آلود تھے ۔ ان کی نوکیں کند ہو چلی تھیں ۔ میں نے ایلس کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی جرأت کر لی ۔ ایلس کے سانولے سپاٹ چہرے پر غم واندوہ کی شدت نقش ہو کر رہ گئی تھی ۔ ایلس خوبصورت نہیں تھیں ۔ لیکن ایلس کا غم نہ جانے مجھے کیوں خوبصورت معلوم ہوا ! ایلس کی بھیگی پلکوں میں یہ دلکشی کی ادائیں نہ جانے کہاں سے آگئیں ۔ میں نے اپنے خیالات پر شرما کر آنکھیں جھکا لیں ۔

ایلس نے رک کر سلسلۂ گفتگو پھر شروع کیا ۔ ایلس کی آواز آنسوؤں میں تر تھی "نسیم وہ مجھے جانتا تھا ۔ اس دن جب جلسہ برخاست ہوا اور وہ ہال سے باہر نکلا تو میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی جرأت کی ۔ نہ جانے اتنی جرأت میں نے کیسے کر لی ۔ میں نے بڑھ کر کہا "مسٹر سرشار مبارک باد! آج کے جلسے کے آپ ہیرو ہیں ....! اور پھر ..... سرشار نے مسکرا کر میرا شکریہ

ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا.....
مسکرا کر تسنیم..... اور..... پھر بھی وہ مجھے پہچان نہ سکا"۔

"چھوڑو اس قصے کو ایلس" نسیم نے ذرا چمک کر کہا "معلوم ہوتا ہے تمہیں اس سڑی شاعر سے محبت ہو گئی تھی..... محبت"

"محبت" ایلس نے تڑپ کر کہا "محبت..... میں کسی سے..... مجھ سے..
...؟ اور ایلس بات پوری نہ کر سکیں۔ جذبات کی شدت گلو گیر ہو گئی۔ پھر ایلس کے اندر سے کھوکھلے قہقہوں کا سیلاب امنڈا۔ وہی قہقہے جو آہوں میں الجھے ہوئے تھے۔ جن سے کچلے ہوئے نسائی غرور کا لاوا پھوٹ رہا تھا۔ یہ قہقہے جو دردناک تھے خوفناک تھے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور نسیم پھر گھبرا گئیں۔ انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایلس کا بازو دبایا اور ایلس یکا یک خاموش ہو گئیں۔ جیسے قہقہوں کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔ یہ خاموشی طوفان کے رک جانے کے بعد خاموشی تھی جب زندگی کی نبضیں ایک دم ساکت ہو جایا کرتی ہیں۔

ایلس کے ہونٹوں پر میں نے مری ہوئی مسکراہٹ کی لکیر دیکھی۔ اور ان کی پلکوں پر نم آلود غبار کو بکھرتے اور سمٹتے ہوئے دیکھا۔ پھر بھیگی پلکوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرے اور نسیم پہلے حیران پھر یکدم اداس ہو گئیں۔ اور گھرر..... گھرر
..... لاری اپنے سفر پر رواں دواں تھی۔ درخت اور کھیت بھاگتے رہے اور سورج کا سرخ آتشیں گولہ مغرب کے رنگین سمندر پر تیرتا رہا حتیٰ کہ منزل کے اس سرے پر پہنچ گیا۔ جس سے پرے خلاؤں کی دنیا ہے اور تب ایک آنسو کی طرح خلا میں ٹپ سے گرا اور گم ہو گیا!

کرامت

پیر سخی بادشاہ کے مزار پر عُرس کی تیاریاں ہو رہی تھیں!

مزار گاؤں سے باہر ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ سامنے ایک سپاٹ میدان تھا اور دُور دور تک کھیت تھے۔ برسات کا موسم ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ باجرے اور مکئی کی فصلیں کٹ چکی تھیں۔ کماد اور کپاس کے ہرے بھرے کھیت ابھی تک موجود تھے۔ باقی کھیتوں میں ہل چل رہے تھے اور وہ گندم کی بوائی کے لئے تیار کئے جا رہے تھے۔ قافلۂ ابرِ باراں کے چند بچے کھچے ٹکڑے ابھی تک اڑ رہے تھے آسمان کی نیلاہٹ، کھیتوں کی سرسبزی اور نرم نرم دھوپ میں مزار کے ہشت پہلو گنبد کی سفیدی دُور دُور سے نظر آتی تھی اور بڑا مقدس منظر پیش کرتی تھی۔

ٹیلے پر مزار کے سامنے ڈھول بج رہا تھا۔ نیچے کے میدان میں دکانیں لگ رہی تھیں۔ ٹیلے سے عین نیچے ایک بوسیدہ سا شامیانہ تنا ہوا تھا اور اُس کے نیچے چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ عین وسط میں چٹائیوں پر دری تھی اور اُس کے اوپر ایک گاؤ تکیے کے سہارے سخی بادشاہ کے جانشین حِین پیر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے مریدانِ باصفا کا حلقۂ ارادت تھا۔ اُن میں چیتھڑے پہنے ہوئے مفلس بھی تھے اور سفید پوش چودھری بھی۔ پیر صاحب عُرس کے انتظام بنفسِ نفیس خود ملاحظہ فرما رہے تھے کبھی کبھار کسی کو ہدایت بھی فرما دیتے تھے۔

پیر صاحب کا لباس پرانی طرز کا تھا ۔ ڈھیلا ڈھالا کھلے بازوؤں کا کرتہ ۔ سر پہ سبز عمامہ ، گلے میں سلیمانی دانوں کی بیش قیمت تسبیح ، پیشانی پر اثر السجود ، داڑھی پہ مہندی کا سرخ رنگ ، آنکھوں میں شب بیداری کی ہلکی ہلکی سرخی اور وہ پرکشش چمک بھی جو روح کے ساز پر مضراب کا کام دیتی ہے اور کہربا کی طرح تنکے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے ، باتوں میں نرمی ، لہجے میں گھلاوٹ اور درد ، عارفانہ دلکشی کی ہر ادا ۔ ایک ایک لفظ پھول بن کر گرتا اور مخلص لوگ انہیں اپنی جھولیوں میں بھر لیتے جیسے وہ نایاب موتی ہوں ۔

چمن پیر حضرت سخی بادشاہ کی دسویں پشت سے تھے ۔ سخی بادشاہ خرقۂ خلافت لے کر بخارے سے آئے یا سمرقند سے لیکن اس اجاڑ جگہ پہ ڈیرہ لگا کر بیٹھ گئے تو جنگل میں منگل ہو گیا ۔ ارد گرد گاؤں کے گاؤں آباد ہو گئے ۔ بنجر زمینیں جو مدت سے کسی سبز نما ہاتھ کا انتظار کر رہی تھیں مسکرا کر بار آور ہو گئیں اور چپہ چپہ سونا اگلنے لگا ۔ لیکن سخی بادشاہ زمین کے بھوکے نہ تھے ۔ اب سخی بادشاہ کے نام پہ آباد ہونے والے گاؤں بھی آباد تھے ۔ تین چوتھائی حصے پہ چوہدری حبیب خان اور اس کے خاندان کا قبضہ تھا اور باقی ایک چوتھائی پر سخی بادشاہ کی دسویں پشت چل رہی تھی ۔ اور تقسیم در تقسیم کے بعد زمین اب مرلوں اور کنالوں کی تنگ دامانی میں سمٹ آئی تھی ۔

چمن پیر کے پاس بھی صرف چند گھماؤں زمین تھی لیکن وہ متولی ہونے کی حیثیت سے نذر و نیاز ، نذرانوں اور چڑھاووں کے حقدار تھے ۔ اس لئے خاصے خوشحال تھے ۔

سخی بادشاہ کو لوگ زندہ پیر کہتے منوں مٹی کے بوجھ اور دس پشتوں کے طویل زمانے کے بعد کے باوجود زندہ تھے ۔ ابھی تک ان سے کرامتوں کا صدور ہو رہا تھا ۔ کہتے ہیں گاؤں میں جب کسی پر ظلم ہوتا اور وہ سخی بادشاہ کے مزار پہ آ کر

فریاد کرتا تو مزار جل جاتا اور گاؤں کے لوگ جب تک اس ظلم کا ازالہ نہ کر دیتے سخی بادشاہ کو چین نہ آتا ۔ مزار کے سرہانے بیری کا ایک ٹنڈ منڈ درخت ہے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سخی بادشاہ کے اپنے مبارک ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے ۔ اس کا تنا کھوکھلا اور خشک ہے ۔ تنے کی چھال صدیوں کے عمل فرسودگی کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کر اتر چکی ہے ۔ لیکن اس کی چوٹی پر ایک سرسبز شاخ ابھی تک موجود ہے جو مزار پر چھتر بن کر سایہ کیے رہتی ہے ۔ نجانے اس سوکھے کھوکھلے تنے کی کون سی رگ زندہ ہے کہ شاخ کے چھتنار تک زندگی کا امرت رس لے جاتی ہے ۔ اس شاخ کے پتے کھانے سے اکثر لوگوں کی منتیں پوری ہوتی ہیں اور دل کی مرادیں بر آتی ہیں اور بیماروں کو شفا ملتی ہے ۔

اور چھن پیر بھی حضرت سخی بادشاہ کے سچے جانشین تھے ۔ وہی نور، وہی انداز وہی کرامتیں ۔ ان کی دم چھو میں بھی جادو کا اثر تھا ۔ لوگ دور دور سے آتے اور فیض پاتے اور سالانہ عرس پر تو صادق الیقین لوگ سندھ اور بلوچستان سے بھی آ پہنچتے ۔

لیکن دسویں پشت کے بعد اس سلسلے کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا ۔ چھن پیر کے تین لڑکے تھے ۔ تینوں کا راستہ مختلف تھا ۔ بڑے صاحبزادہ صاحب کالج کو ہاتھ لگا کر اب واپس گاؤں پہنچ چکے تھے ۔ وہ کھیل کود کے دلدادہ تھے ۔ گاؤں کے نوجوان ٹولے کے سردار ۔ شکار کے رسیا ۔ تاش کے ہر کھیل کو جاننے والے ۔ چوہدری ہیبت خاں کے لڑکے بہرام خاں سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی ۔ سارا دن تاش کا کھیل جاری رہتا ۔ لوگ اسے برا سمجھتے لیکن چھن پیر ایک دو بار سرزنش کر کے خاموش ہو رہے تھے ۔ تاہم انہیں یہ کھٹکا مسلسل لگا رہتا کہ ان کے بعد گدی نشینی کا کوئی اہل نہیں ۔ دوسرے دونوں بچے کھلنڈرے تھے ۔ اور ان میں سے بھی کسی نے ان

جوہر کا اظہار نہیں کیا تھا جو مسند ارشاد کے قابل بناتا ہے۔ اس لئے مجبور ہو کر انہیں بھی دنیاوی تعلیم کی طرف راغب کرنا پڑا اگرچہ فرصت کے وقت پیر صاحب انہیں مذہبی کتب کے چند لفظ بھی پڑھا دیا کرتے تھے لیکن یہ کڑوے گھونٹ اُن کے حلق سے نیچے نہ اترتے اور پیر بادشاہ مجبور ہو کر سختی پر اتر آتے اور یہ سختی بھی بے نتیجہ رہتی۔

دوسرے دن عرس تھا!

چونکہ پیر عرس پر شدت سے لہو لعب سے گریز کرتے۔ آج تک سخی بادشاہ کی خانقاہ پر پائل کی جھنکار بلند نہ ہوئی تھی البتہ قوال ضرور ہوتے لیکن اُن کے طبلے ہارمونیم اور سارنگیاں بھی عارفانہ غزلوں کی چند تانوں سے آگے نہ بڑھ سکتیں عرس پر میلہ ضرور لگتا۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ بھی لگ جاتے۔ بازار کی رونق بھی ہوتی۔ گاؤں کی مٹیاریں بھی بن سنور کر میلے میں گھومتیں لیکن اس کے باوجود عرس ایک ذریعہ تھا لوگوں کو عارفانہ کلام اور وعظ و نصیحت کے چند لفظ سنانے کا۔ عرس پر کوئی نہ کوئی واعظِ شیریں مقال بھی آتے اور لوگوں کو سلوک و معرفت کی بلند منزلوں کی طرف بلانے کا فرض ادا کرتے۔

تاہم اس عرس پر صاحبزادہ صاحب کبڈی اور کشتی وغیرہ کی بدعتوں کو جاری کرنے کا عزم صمیم کر چکے تھے اور پیر صاحب انہیں بے ضرر سمجھ کر خاموش ہو گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ صاحبزادہ صاحب کسی نہ کسی کام میں مشغول رہیں۔ بے کار آدمیوں کو شرارتوں اور برائیوں کے علاوہ کیا سوجھتا ہے؟ خدا کا شکر ہے کہ ابھی انہوں نے طوائف کے مجرے کے لئے اصرار نہیں کیا تھا۔ ورنہ اکثر خانقاہوں پر صبح و شام طبلوں کی گمک کے ساتھ پائل کی جھنکار بھی بلند ہوتی رہتی الحمد للہ سخی بادشاہ کی خانقاہ ناپاک قدموں کے ابلیسی رقص سے محفوظ تھی!

مغرب کی نماز سے پہلے پہلے سارے انتظامات مکمل ہو گئے۔ مغرب کی نماز کے بعد باہر سے آنے والے عقیدت مندوں کو لنگر سے کھانا تقسیم ہوا اور عشا کے بعد تو کچھ لوگ گاؤں میں رات بسر کرنے کے لئے چلے گئے اور کچھ شامیانے کے نیچے بازوؤں کا تکیہ لگا کر سو گئے۔ پیر صاحب ہر طرح سے اطمینان کر کے گھر جا رہے تھے کہ راستے میں انہیں چوہدری ہیبت خاں ملا۔ "پیر بادشاہ! آج میں خدمت میں حاضر نہ رہ سکا۔ کوئی میرے لائق کام ہے؟"

"سب کام بفضلہ ٹھیک ہو رہے ہیں۔ البتہ عرس پر ضرور حاضر رہیں۔"

"انشاء اللہ پیر بادشاہ!"

چوہدری ہیبت خاں سے دو باتیں کر کے پیر صاحب نے دو قدم ہی بڑھائے ہوں گے کہ ایک آواز نے انہیں پکارا "پیر بادشاہ!"

"کون ہے؟" پیر صاحب نے چونک کر پوچھا اور پیر نے خود ہی آواز پہچان کر کہا "کریم تم ہو؟ اچھا ہوا تم آ گئے۔" پیر صاحب نے اپنے لہجے میں خوش آمدید کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"پیر بادشاہ! میں ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضروری بات . . . . کیسی . . . ؟" پیر صاحب نے گھبرا کر کہا "صبح مسجد میں ہو۔ اس وقت ہم تھک کر گھر آرام کی غرض سے جا رہے ہیں۔"

"پر پیر بادشاہ وہ بات بہت ضروری ہے۔" کریم نے لجاجت سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں۔ ہاں لیکن یہ کون سا وقت ہے بات کرنے کا؟" پیر صاحب کے لہجے میں خشونت تھی وہ جاکر دربار شریف میں شامیانے کے نیچے رات گزارنے والوں [illegible] پیر صاحب نے بڑبڑاتے ہوئے قدم بڑھا لئے "کم بخت نے مزا کرکرا کر دیا"

ہے ۔ جب دیکھو راستہ روکے کھڑا ہے ۔ میرے پاس قارون کا خزانہ تو نہیں کہ لٹاتا پھروں ؟"

کریم بخش کبھی پیر صاحب کا خاص الخاص خادم تھا ۔ برسوں اُن کے پاس رہا ۔ اُنہیں وضو کراتا ۔ اُن کے ساتھ مریدی دورے پر جاتا ۔ اُن کے سارے گھر کا کاروبار اُسی کے سپرد تھا ۔ بیبیاں اُس سے پردہ نہیں کرتی تھیں ۔ حویلی کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی اُسے رہنے کے لئے دی ہوئی تھی ۔ کریم کی اکلوتی لڑکی اسی گھر میں پیدا ہوئی اور پیر صاحب کی نظروں کے سامنے اُنہیں کے جھوٹے ٹکڑوں پر پل پوس کر جوان ہوئی ۔ بڑے صاحبزادہ کے ساتھ کھیلتے کودتے پروان چڑھ گئی ۔ اور ایک دن ایسا آیا جب پیر صاحب نے اُن دونوں کو کھیلتے اور چہچہاتے ہوئے دیکھا اور اُن کا تن بدن کانپ گیا ۔ صحن کے ایک کونے میں اُگا ہوا گلاب کا پودا ہر وقت نظروں کے سامنے رہتا ہے اور اس کی ہستی معمول کا ایک جزو بن کر شعوری نظارے کو دعوت نہیں دیتی لیکن جب اُس کی ٹہنی پر سرخ بھرا بھرا پھول شبنم سے دُھل کر اپنی تمام رعنائیوں کو لئے ہوئے چٹک اُٹھتا ہے اور شرمیلی خوشبوؤں کا ایک ریلا شام میں در آتا ہے تو شعور کی آنکھ یکدم بیدار ہو جاتی ہے اور گلاب کا پودا ایک چونکا دینے والی حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے اور پیر صاحب نے اپنے خادم کریم کو بلا کر کہا "کریم بخش ! تمہاری لڑکی جوان ہو چکی ہے "

" جی ! پیر بادشاہ "

" اب تمہارا اس لڑکی کے ساتھ میرے گھر میں رہنا کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا "

" کیوں پیر بادشاہ ؟" کریم نے حیران ہو کر پوچھا ۔

" تم نہیں سمجھے ۔ صاحبزادہ صاحب ماشاء اللہ جوان ہو چکے ہیں ۔ اسی گھر میں ایک

جوان لڑکی کا۔۔۔"

"پیر بادشاہ!" کریم نے یکایک حقیقت کا احساس کرتے ہوئے گھبرائی ہوئی
آواز میں کہا "صاحبزادہ صاحب اور شیداں اکٹھے کھیل کود کر بڑھے۔ وہ۔۔۔"
"کریم! ہم تمہارے لیے دکان کا انتظام کیے دیتے ہیں۔ تم بال بچوں کو لے
کر وہاں اُٹھ جاؤ۔ ہماری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ وہ نامحرم اکٹھے رہیں۔ آگ لگنے
سے پہلے ضروری ہے کہ ہر چنگاری بجھا ڈالی جائے۔ آگ بھڑک اُٹھے تو سات
سمندروں کا پانی بھی اُسے نہیں بجھا سکتا۔"

کریم کے ہر احتجاج کے باوجود اُسے گاؤں کے شمالی کونے میں ایک گھروندا
دے دیا گیا لیکن کریم کے اخلاص اور معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ تہجد سے پہلے
پیر صاحب کے ہاں پہنچتا۔ سردیاں ہوتیں تو اُن کے لئے وضو کا پانی گرم کرتا۔
گرمیاں ہوتیں تو کنوئیں سے تازہ پانی بھر کر لاتا۔ وضو کرواتا۔ نہلاتا دھلاتا۔
صبح سے لے کر عشا تک ان کی خدمت کرتا۔ باقاعدہ مریدی دورے پر ساتھ جاتا
اور اس طرح بڑی آسانی سے گھر بھر کی روٹیاں اکٹھی کر لیتا۔ بیبیاں اپنے پرانے
کپڑے دے دیتیں جو اس کی لڑکی شیداں پہنتی۔ اور گاؤں کی اکثر لڑکیاں اُسے رشک
کی نگاہ سے دیکھتیں۔

شیداں کچھ خوبصورت بھی نہ تھی۔ سانولا رنگ۔ چہرے کے نقوش نہ تیکھے
نہ سپاٹ۔ ہاتھ پاؤں عام گنوار مٹیاروں کی طرح بھاری اور مضبوط۔ نہ آنکھوں
میں نرگس کی حیرت نہ دہانہ غنچے کی طرح تنگ لیکن اس کے باوجود جب وہ صاف
ستھرے کپڑے پہن لیتی اور دوسرے تیسرے روز نہا دھو لیتی تو جوان مورنی کی طرح
اُس کے قدم زمین پر نہ ٹکتے۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کے مقابلے پر ہونے کا
یہ احساس اُسے حسن تو عطا نہ کر سکا لیکن نسائیت کی کئی اداؤں کو ضرور جلا دے

گیا تھا اور اسی لیے جب وہ گاؤں کی گلیوں میں سے گزرتی تو گاؤں کے نوجوان دل تھام لیتے۔ کریم ذات کے لحاظ سے کمین تھا۔ گاؤں کے چوہدری اس کی لونڈیا کی اس پرغرور جوانی کو غصے کی نگاہوں سے دیکھتے اور پیر بڑے صاحب زادہ صاحب چھپ چھپا کر اس گلی میں سے کبھی کبھار گزر جاتے تو لوگوں کے غصے اور کینے کو مہمیز لگ جاتی۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اسے دیکھتیں تو کہتیں "آخر کمین ہے نا! جوانی کا کتنا مان ہے۔ زمین پر پاؤں ہی نہیں ٹکتے۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے"!

"اس کے دیدوں کا پانی تو مر ہی گیا ہے پر یہ گاؤں کی عزت بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے گی"!

ایک دن شام کے قریب پیر صاحب گلی میں سے گزرے تو شیداں اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ پیر صاحب کو دیکھ کر اندر جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ کریم نے دور سے پکار کر کہا "شیداں بیٹی! اندر آنگن میں چارپائی بچھا کر اس پر دھلا کھیس ڈال دے۔ آج پیر بادشاہ ہمارے گھر آ رہے ہیں"۔ کریم کی آواز میں خوشی کی لرزشیں تھیں۔ وہ مدت سے اصرار کر رہا تھا کہ پیر صاحب اس کے گھر کو بھی اپنے مبارک قدموں سے برکت دیں اور آج پیر صاحب ایک بیمار چوہدری کی عیادت کر کے گلی میں سے گزر رہے تھے کہ ان کی ضمیر نے پکار کر کہا "ایک عقیدت مند تیرے قدموں کو باعثِ یمن و برکت خیال کرتا ہے اور تو اس کی اس چھوٹی سی خواہش کو بھی پورا نہیں کر سکتا"۔ اور ان کے نفس نے ان کی ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ دیا۔

پیر صاحب نے آنگن میں قدم رکھ کر کہا "کریم! مغرب کی اذان ہونے والی ہے ہم چند لمحوں کے لیے بیٹھیں گے"۔ شیداں اس اثنا میں چارپائی بچھا کر اس پر اجلا کھیس ڈال چکی تھی۔ پیر صاحب نے پوچھا "کریم! آج شیداں گھر میں اکیلی معلوم ہوتی ہے"؟

"جی سرکار! اس کی ماں کل سے میکے گئی ہے۔"

پیر صاحب نے چارپائی پر بیٹھ کر کہا "کریم! تم نے شیداں کے لئے کوئی رشتہ ڈھونڈ لیا ہے؟"

"جی ہاں پیر بادشاہ! اس کے ماموں کے ہاں اس کی بات پکی ہو چکی ہے۔"

"الحمد للہ جوان لڑکیوں کو زیادہ دیر تک گھر میں بٹھائے رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ اس کی شادی پر میں حسب توفیق تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ مجھے کچھ دن پہلے بتا دینا" کریم کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے گویا زمین پر بچھتے ہوئے کہا "پیر بادشاہ! تیری نظر کی ضرورت ہے۔ بس۔۔۔" اور کریم اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اُس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دروازے سے چپک گئیں۔ پیر صاحب نے گھوم کر دیکھا تو اُن کا جسم سُن ہو گیا۔ صاحب زادہ صاحب کا ایک قدم دہلیز کے اندر اور دوسرا باہر تھا اور وہ زمین میں گڑ کر بت بن چکے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے قدم دہلیز سے باہر کھینچا۔ مڑے اور گلی میں غائب ہو گئے۔ معاً مغرب کی اذان تھرتھرائی۔ پیر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے گلی میں قدم رکھا تو کریم بھی پیچھے پیچھے تھا۔ مسجد میں پہنچ کر انہوں نے وضو کیا اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ نوافل پڑھ چکنے کے بعد جب وہ مسجد سے نکل کر گلی میں آئے تو کریم پھر بھی اُن کے پیچھے پیچھے تھا۔ گھر کی ڈیوڑھی میں قدم رکھا انہوں نے مڑ کر کریم کو دیکھا۔ کریم شرم اور غیرت کے بوجھ تلے جھکا ہوا دروازے میں کھڑا تھا۔ پیر صاحب نے سرد لہجے میں کہا "کریم! آج تم ہمیں اپنے گھر میں اپنی غیرت کا جنازہ دکھلانے کے لئے لے گئے تھے۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ پیر بادشاہ۔۔۔ مجھے اس بات کا پتہ نہ تھا۔ میں نمک حرام نہیں۔ میں بے غیرت نہیں۔ میں شیداں کا منہ کالا کر کے چٹیا کاٹ کر گلی گلی پھراؤں گا۔"

"نہیں ....!" پیر صاحب نے دھیرے سے کہا "اس بات کا چرچا نہ کرو۔ تم چپکے سے اپنا گھر بار بیچ کر کسی دوسرے گاؤں میں چلے جاؤ۔"

کریم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے حسبِ معمول عشاء کی نماز پیر صاحب کے ساتھ پڑھی اور جب پیر صاحب استراحت کے لئے زنانے میں چلے گئے تو وہ بوجھل قدموں کے ساتھ گھر آیا۔ اُس نے شیداں کی طرف آگ سے بھری ایک نظر ڈالی پر زبان سے کچھ نہ کہا اور ساری رات اُس کی کروٹیں بدلتے گذر گئی اور اُسے نیند نہ آئی۔ صبح کاذب کے وقت وہ حسبِ معمول جاگا اور پیر صاحب کے ہاں چلا آیا۔ انہیں تہجد کی نماز کے لئے وضو کروایا۔ صبح کی نماز کا وقت ہوا تو کریم اُن کے ساتھ مسجد میں گیا۔ مسجد سے واپس آکر پیر صاحب نے اسے سو روپے دیتے ہوئے کہا "کریم! تو ہمارا پرانا خدمت گار ہے تجھے اپنے سے جدا کرتے ہوئے قلق بھی تو ہوتا ہے لیکن کیا کیا جائے۔ میں تقدیر کے آگے مجبور ہوں۔ خاندان کی عزت کا سوال ...!"

کریم نے سو روپے لئے تو اُس کی خشک آنکھوں سے رُکا ہوا سوتا پھوٹ بہا۔ اُس کی داڑھی تر ہو گئی اور اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پیر صاحب نے بڑی شفقت کے ساتھ اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "کریم! تقدیر کے آگے سپر ڈال دو۔" اور تیسرے دن کریم اپنے آبائی گاؤں پر حسرت کی ایک نظر ڈال کر چار کوس دور نور پور چلا گیا۔

لیکن کریم اپنے نئے ماحول میں رس بس نہ سکا۔ ایک ڈگر پر چلتے چلتے زندگی میں وہ لچک باقی نہ رہی تھی جو نئے حالات سے سازگار ہو جاتی ہے زندگی کی نہج متعین ہو چکی تھی۔ اب اُس سے تھوڑا سا انحراف بھی مشکل تھا۔ اُس نے ساری عمر اپنے ہاتھوں سے کوئی محنت کا کام نہیں کیا تھا۔ اب وہ ہل چلانے، نلائی کرنے،

فصل کاٹنے اور گھاس کھودنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اُس کے پاس نقد سو روپے تھے۔ فصل کی کٹائی ہو رہی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو کٹائی کر کے سال بھر کا غلہ اکٹھا کر لیتا لیکن مصلّے پر بیٹھنے والا اور ورد وظائف کی جنت میں گم رہنے والا کریم چلچلاتی دھوپ میں پسینہ بہانے کی زحمت کیسے گوارا کر لیتا۔ اُس نے اللہ پر ڈور چھوڑ دی اور اندوختہ اور سو روپے چھ ماہ کے اندر اندر ختم ہو گئے۔

ان چھ مہینوں میں وہ دسویں پندرھویں دن پیر صاحب کے ہاں حاضری ضرور دیتا۔ اگر پیر صاحب کے پاس کوئی مرید آئے ہوئے ہوتے تو وہ نذرانہ دیتے وقت کریم کو بھی ایک دو روپیہ دے دیتے لیکن چھ ماہ کے بعد جب افلاس اور فاقوں نے اپنی پہلی خفیف سی جھلک دکھائی تو وہ پیر صاحب کے سامنے جا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اُس نے منہ سے کوئی بات نہ کہی لیکن پیر صاحب نے تسلی و تشفی کے الفاظ اور دعاؤں کے علاوہ اُسے کچھ رقم اور جنس بھی دی۔ اندر سے بیبیوں نے اپنے اُترے ہوئے کپڑے دئیے اور کریم واپس اپنے گاؤں آ گیا۔ چند ماہ اور گذر گئے۔

اور ایک دن جب کریم اپنے صحن میں بیٹھا ہوا پھر پیر صاحب کے ہاں جا کر ہاتھ پھیلانے کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اُس کی بیوی اُس دن فاقے سے بچنے کے لئے کسی چوہدری کے ہاں اناج پھٹکنے گئی ہوئی تھی تو بڑے صاحب زادہ صاحب اچانک اندر آ گئے۔ کریم نے چونک کر تعظیم دی اور کہا "صاحبزادہ صاحب خیر تو ہے؟ بڑے پیر صاحب ماشاءاللہ خیریت سے تو ہیں؟"

"ہاں۔ ہاں۔ ہر طرح سے خیریت ہے۔ میں بہرام خاں کے ساتھ رحیم پور کے ایک چودھری کے ہاں شادی میں گیا ہوا تھا۔ تمہارا گاؤں راستے میں پڑتا تھا۔ خیال آیا کہ تم سے بھی ملتا چلوں۔ آخر خاندان کے پرانے نمک خوار ہو۔"

کریم خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ وہ دوڑ کر اندر سے چارپائی اُٹھا لایا۔ اُس نے

اونچی آواز میں کہا "شیداں بیٹی! دیکھ تو صاحب زادہ صاحب آئے ہیں۔ اندر سے کھیس لا اور چارپائی پر بچھا دے۔" شیداں کھیس لے کر آئی تو کریم چپکے سے باہر چلا گیا۔ صاحب زادہ صاحب نے میدان صاف دیکھا تو شیداں کو سر سے پاؤں تک دیکھنے کی جرأت کر لی۔ شیداں پھول دار چھینٹ کی قمیض اور رنگ دار پاپلین کی شلوار پہنے ہوئے تھی جس کے پائینچے اُدھڑے ہوئے تھے۔ یہ کپڑے صاحبزادہ صاحب کے گھر کی اُترن تھے۔ لیکن ان بوسیدہ کپڑوں سے بھی شیداں کی جوانی نکھر آئی تھی۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اُس کے سانولے رخساروں پر شرم کی شفق پھول رہی تھی۔ معمولی شکل و صورت کی شیداں صاحبزادہ صاحب کو بے انتہا حسین معلوم ہوئی۔ ویرانی میں کھلے ہوئے پھول کی طرح جس کی پتیاں کھردری ہوتی ہیں اور جس کا رنگ تیز دھوپ میں لُو کے تھپیڑوں سے مرجھایا ہوا ہوتا ہے لیکن جو گداز نہ ہونے کے باوجود اپنے ماحول میں حسن و خوبی کا مرقع دل پذیر نظر آتا ہے۔

صاحبزادہ صاحب چارپائی پر دیر تک گنگ ہو کر بیٹھے رہے۔ اس سے قبل وہ اپنے گاؤں میں چھپ چھپا کر اُس سے ایک دو باتیں کر لیا کرتے تھے۔ اب چھ ماہ کے بعد بات کرنی مشکل معلوم ہو رہی تھی۔ ہونٹ خشک تھے اور زبان گویا تالو سے لگ چکی تھی۔ ایک عرصے کے بعد انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا "شیداں!" شیداں لرز کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اُس کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سُرخ ہو گیا۔ اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور اُس کی نگاہوں نے جھک کر کہا "جی!"

"آ... آ... آج دیکھو میں آ ہی گیا۔"

شیداں کے ہونٹ کانپے لیکن اس سے پہلے کہ لرزشیں لفظوں کے آہنگ میں ڈھل سکیں کریم کسی چوہدری کے ہاں سے ایک پیالہ دودھ مانگ کر لے آیا۔ اُس نے دونوں کو دیکھا لیکن بالکل نہ ٹھٹکا۔ اُس نے آگے بڑھ کر پیالہ صاحبزادہ صاحب کی خدمت

میں پیش کرتے ہوئے کہا "صاحبزادہ صاحب! آپ کا خادم کریم اس سے زیادہ کیا خدمت کر سکتا ہے" صاحبزادہ صاحب نے کانپتے ہاتھوں سے پیالہ لیا اور غٹ غٹ پی گئے۔ پھر کریم نے شیداں سے کہا "شیداں بیٹی! میں ذرا صاحبزادہ صاحب کے لیے حقہ تازہ کر لاؤں" کریم نے حقہ ہاتھ میں لیا اور باہر جانے لگا۔ صاحبزادہ صاحب اپنی جیب ٹٹول کر کہنے ہی والے تھے کہ بابا کریم حقہ بھرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس سگریٹ ہیں لیکن نہ جانے کس مصلحت نے ان لفظوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اور کریم حقہ لے کر پھر دروازے سے باہر نکل گیا۔

صاحبزادہ صاحب نے پھر نظریں اٹھا کر شیداں کو دیکھا۔ شیداں اُن کی طرف پیٹھ کیے ذرا دور کھڑی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے دھیمے سے کہا "شیداں!" انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

"یہاں آؤ!"

شیداں نے قریب آ کر کہا "جی!"

"تم نے کبھی ہمیں یاد کیا؟" شیداں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پہلے ایک دو لمحوں کے لیے اُس کی آنکھیں جھکی رہیں۔ پھر اُس نے نظریں اُٹھائیں تو اُن میں شرارت کی بجلیاں تھیں۔ ایک الھڑ جوانی نے اٹھلا کر کہا "نہیں ۔۔۔۔ مجھے یاد کرنے کی کیا پڑی تھی بھلا!" صاحبزادہ صاحب پہلے حیران ہوئے۔ پھر مسکرائے اور آخر انہوں نے جرأت کر کے شیداں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ ہاتھ کورے کھدر کی طرح کھردرا تھا۔ اس کی ہتھیلی میں بھی گداز نہیں تھا۔ موٹی موٹی انگلیوں کے ان گھڑت پوروں میں بھی کوئی نفاست نہ تھی لیکن نجانے یہ ہاتھ کیوں اتنا گرم اور تر تھا۔ اس میں زندگی کی فراوانی تھی۔ اور ایک لمحے کے اندر اندر صاحبزادہ کے ہاتھ کی گرفت میں اس ہاتھ کی درشتی اور سختی پگھل کر موم بن گئی تھی۔ ایک دھیمی سی آنچ صاحبزادہ کے تن میں گھل

بل کہ اُن کے احساس کو بیچھا کر اُن کی پیشانی کو پسینے سے تر کر گئی۔ انہوں نے گرفت کو سخت کرتے ہوئے شیداں کو اپنی طرف کھینچا۔ شیداں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی "آپ کیا کر رہے ہیں" اُس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ اور کھٹکے دروازے سے حقہ ہاتھ میں لئے ہوئے کریم اندر داخل ہوا۔ اُس نے یہ لفظ سن لئے۔ اُس نے شیداں کے ہاتھ کو صاحبزادہ صاحب کے ہاتھ میں دیکھا۔ اُس کا ایک قدم ٹھٹکا لیکن دوسرا آگے بڑھ آیا۔ صاحبزادہ صاحب اُس مجرم کی طرح کانپے جس کا جرم آشکارا ہو گیا ہو لیکن دوسرے لمحے کریم اُن کی چارپائی کے پاس نیچے فرش پر بیٹھ گیا اور اُس نے حقے کی نے اُن کی طرف موڑ دی۔ صاحبزادہ صاحب نے ایک سہما سہما کش لیا لیکن کریم سے نظریں نہ ملا سکے۔ شیداں چپکے سے کھسک کر مکان کے اندر چلی گئی۔ دیر تک صاحبزادہ صاحب کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

"کریم! اب میں جاتا ہوں"۔

"آج یہیں رہ جائیں صاحبزادہ صاحب!"

"نہیں۔۔۔" صاحبزادہ صاحب نے خوف سے لرز کر کہا "نہیں۔۔۔" انہوں نے سہمی ہوئی نظریں جھکا لیں "کتنی عجیب بات ہے!" انہوں نے سوچا" اس نے مجھے عین موقع پر دیکھ لیا تھا۔ شیداں کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور یہ مجھے کہہ رہا ہے کہ میں رات اُس کے ہاں رہ جاؤں۔ اِس میں کیا راز ہے؟" اور انہوں نے کنکھیوں سے کریم کو دیکھا اور اُن کا خوف حیرت میں بدل گیا۔ کریم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں چمک تھی اور اس مسکراہٹ، اس چمک میں ایک عجیب رمز تھی۔ صاحبزادہ صاحب کے حواس جو خوف اور حیرت کے تند تھپیڑوں سے بکھر چکے تھے یک جا ہوئے تو اُن کا سوچ کچھ واضح ہو گیا اور وہ بہت حد تک اس مسکراہٹ

کا مطلب سمجھ گئے ۔ انہوں نے سوچا "شیداں اب بھرپور جوان ہے ۔ ابھی ابھی وہ آگ کی دھیمی سی آنچ بن کر اُن کے انگ انگ میں رچ گئی تھی اور بابا کریم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے ۔ اس کا مطلب ہے" انہوں نے اپنے آپ سے پوچھا لیکن کوئی فیصلہ کن جواب نہ پا کر وہ چارپائی سے بادلِ نخواستہ اُٹھے ۔

"نہیں بابا مجھے جانا چاہیے ۔ میں آج رات یہاں رہ گیا تو ابا سے کیا بہانہ کروں گا؟"

"اچھا آپ کی مرضی" کریم نے بدستور مسکراہٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا ۔

"پھر موقع ملا تو ضرور آؤں گا" صاحبزادہ صاحب نے ذرا اونچی آواز میں کہا تاکہ شیداں بھی سن سکے "میری گھوڑی باہر تکیئے میں بندھی ہے بابا کریم" کریم نے کہا ۔ "میں بھی کو زین کستا ہوں ۔ آپ حقّے کے ایک دو کش اور لگالیں" اور کریم لپک کر باہر نکل گیا ۔ صاحبزادہ صاحب پھر حیران ہو کر فضائیں میں گھورنے لگے ۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا "شیداں!"

شیداں آواز سن کر باہر نکلی ۔ اب اُس کی چال میں جھجک نہیں تھی بلکہ تمکنت اور غرور کی فراوانی تھی ۔ وہ عورت بیدار ہو چکی تھی جس کی نسائیت کو پہلی بار آواز دے کر بلایا گیا ہو ۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی ہوئی آئی اور اُس نے قریب آکر پوچھا "کہیے؟" صاحبزادہ صاحب اُس کے لہجے کی اس خوداعتمادی سے چونک کر دب گئے ۔ انہوں نے تتلا کر کہا "کچھ بھی نہیں ...... میرا مطلب ہے ...... میں جا رہا ہوں" شیداں نے یہ نہ پوچھا کہ آپ پھر کب آ رہے ہیں اور صاحبزادہ صاحب مایوس ہو کر شیداں کے آنگن سے نکلے اور باہر گلی میں آ گئے ۔ انہوں نے ایک بار مڑ کر دیکھا ۔ شیداں آنگن میں کھڑی تھی ۔ اُس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی جو اُس نے کریم کے ہونٹوں پر دیکھی تھی ۔

نکڑ میں پہنچ کر انہوں نے گھوڑی کی باگ ہاتھ میں لی۔ رکاب میں پاؤں رکھا اور اچک کر پیٹھ پر بیٹھ گئے۔ گھوڑی دو قدم آگے بڑھی تو انہوں نے باگ کھینچتے ہوئے کہا "بابا کریم!" کریم قریب آیا تو انہوں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر کہا "بابا! تو ہمارے گھر کا پرانا خادم ہے۔ یہ لو"۔ کریم بے تاب ہو کر بڑھا اور اس نے صاحبزادہ صاحب کے ہاتھوں سے نوٹ چھین کر کہا "آپ پھر کب آئیں گے؟" کریم نے نوٹ کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں اس حریص بھوکے شکاری کا ہوس آمیز اشتیاق لہرایا جو شکار کو آہستہ آہستہ جال کا رخ کرتے ہوئے دیکھ رہا ہو!

اور اس دن کریم نے بڑے پیر صاحب کے ہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

"اب تو گنگا گھر میں بہے گی۔ کنواں خود چل کر پیاسوں کے پاس پہنچ چکا ہے۔ ہوں! مجھے اب پیر بادشاہ کے آگے گڑگڑانے کی کیا ضرورت ہے؟" اس کا چہرہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں اس کا کچلا ہوا غرور انتقام کی آگ بن گیا "میں نے کیا قصور کیا تھا کہ پیر بادشاہ نے ان بوڑھی ہڈیوں کو گھر سے نکال باہر کیا؟" پھر اسے شیداں کا خیال آیا اور ایک خوف کالے بادل کی طرح امڈا اور اس کے دل پر چھا گیا۔ بجلیاں کڑکیں اور ان کی گھن گرج میں وہ تنکے کی طرح اڑا اور پس کر رہ گیا "نہیں... نہیں... میں..." اس نے کہا "لیکن میں بوڑھا ہوں... میں منگی پر مجبور ہوں!" اور ایک قطرہ پھسل کر اس کی داڑھی میں جذب ہو گیا۔

اس رات اس نے شیداں کی ماں کو صاحبزادہ صاحب کے آنے کی خبر سنائی تو اس نے گھبرا کر کہا "پیر بادشاہ کیا کہیں گے؟ یہ اچھا نہیں ہوا۔ اب ہمیں نورپور سے بھی نکلنا پڑے گا؟"

"نہیں!" کریم نے غصے سے ہونٹ بھینچ کر کہا "ہمیں پیر بادشاہ کی کیا پروا؟ وہ ہمیں

دلیں نکالا بھی دے دیں تو صاحبزادہ صاحب ہمارے ہاں آتے رہیں گے۔" شیداں کی ماں نے حیران ہو کر پوچھا "پر صاحبزادہ صاحب ہمارے ہاں کیوں آئیں گے؟ انہیں ہمارے گھر سے کیا ملے گا؟" کریم کی آنکھ جھکی۔ اس کے ہونٹ پھڑکے۔ پھر چمک بجھ گئی۔ اُس نے آنکھیں جھکا کر رندھے ہوئے گلے سے کہا "شیداں!"

"شیداں!" کریم کی بیوی نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں! ہاں! جس آگ کو بھڑکنے سے پہلے ہی بجھا دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ بجھ نہیں سکی۔ آگ بھڑک چکی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"بجھارتوں میں بات کر رہے ہو۔"

"تو نہیں سمجھے گی۔ ادھر آ بتلاؤں۔" کریم نے قہقہہ لگا کر کہا۔ شیداں کی ماں نے چند لمحے حیران ہو کر کریم کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اُس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کریم نے اُس کے کان میں سرگوشی کی تو اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ اُس کا جسم شدت سے کانپا۔ چند لمحوں کے لئے اُس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ اُس نے گلے پر ہاتھ رکھا اور پھر خشک گلے سے آہوں اور سسکیوں کا دھواں اُٹھا۔ اُس نے سوکھے ہونٹوں پر سوکھی زبان پھیرتے ہوئے کہا "شش... شش... شرم کرو... سفید داڑھی پر کالک ملنا چاہتے ہو۔ آگ لگ جائے تو صرف دوسروں کا نہیں اپنا بھی گھر جل جایا کرتا ہے!"

"[illegible]!" کریم نے بڑے سکون سے کہا "شیداں کو سمجھا دے۔ دیکھ میری بوڑھی [illegible] استطاعت کہاں کہ میں کمین بن کر دوسروں کا کام کرتا پھروں۔ بھوکوں مرنے سے بہتر ہے۔"

"نہیں... !" شیداں کی ماں نے آنسوؤں کے طوفان میں سے کہا "لوگ ہمارے منہ پر تھوکیں گے۔ ہم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ میں اس بے شرمی میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔" کریم نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ شیداں کی ماں دو دن

تک کریم سے نہ بولی ۔

ایک ہفتے بعد صاحبزادہ صاحب پھر نور پور کسی بہانے سے آئے ۔ شیداں گھر پر نہیں تھی ۔ دو گھڑی بعد مایوس ہو کر جب وہ اُٹھنے ہی والے تھے تو کریم نے کہا ۔

"صاحبزادہ صاحب! آپ جا رہے ہیں؟"

"ہاں، ہاں! میں نے سوچا تھا کریم ہمارے گھر کا پرانا خادم ہے ۔ میں اُس سے ملتا چلوں ۔ اب مجھے جانا چاہیئے ۔"

لیکن عین اُسی لمحے شیداں آنگن میں آ گئی ۔ صاحبزادہ صاحب کے قدم خود بخود رُک گئے ۔ انہوں نے پھر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا ۔ "بابا! اگر تم چاہتے ہو تو ایک گھڑی اور بیٹھ جاتا ہوں ۔" کریم چپکے سے باہر نکل گیا ۔ شیداں کی ماں آج پھر گھر میں موجود نہیں تھی ۔ صاحبزادہ صاحب کچھ دیر خالی آنگن میں گھورتے رہے ۔ یکایک ایک سایہ لپکا ۔ صاحبزادہ صاحب نے چونک کر دیکھا ۔ شیداں اُن کے پاس سے گزر رہی تھی ۔ صاحبزادہ صاحب نے لپک کر اُس کی قمیض کا دامن پکڑ لیا ۔ شیداں نے مڑ کر بڑی پرغرور نگاہوں سے دیکھا گویا پوچھ رہی ہو تمہیں یہاں کس نے بلایا ۔ صاحبزادہ صاحب نے بڑی لجاجت سے کہا "شیداں!" شیداں کے قدم ڈگمگائے ۔ اُس کا رواں رواں محبت کے اس بلاوے پر پھڑک گیا ۔ لیکن نسائی غرور نے اُس کا دامن پکڑ لیا ۔ اُس نے جذبات کی رو پر قابو پاتے ہوئے بڑے سکون سے پوچھا "تم یہاں کیوں آ گئے ہو؟"

"تمہیں ۔ صرف تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لئے ۔" صاحبزادہ نے [illegible] ہوئے کہا ۔

"ہونہہ!" شیداں نے ایک جھٹکے سے دامن چھڑا کر کہا ۔

"ہم غریبوں سے کیوں ملنے آتا ہے ۔ تم ہمیشہ کسی بہانے سے آ جاتے ہو ۔"

"نہیں شیداں.... مجھے اس گاؤں میں کوئی کام نہ تھا سچ جان صرف تجھی سے ملنے کے لئے آیا" شیداں مسکرائی۔ صاحبزادہ صاحب اس مسکراہٹ کے سامنے اڑے اور ان وادیوں میں آوارہ ہو گئے جہاں محبت کی پہلی کرن پھوٹ کر اجالوں کا سیلاب بن جاتی ہے۔ ابھی وہ آسمان سے زمین پر لوٹ کر نہ آئے تھے کہ بابا کریم سامنے آ موجود ہوا۔ انہیں کریم سے نفرت محسوس ہوئی لیکن وہ کانپ کر بیٹھ گئے۔ شیداں وہاں سے ہٹ کر اندر چلی گئی اور اس ملاقات کے بعد صاحبزادہ صاحب اُس جال میں پوری طرح پھنس کر رہ گئے جو کہ کریم نے بڑی احتیاط سے بچھایا تھا۔

صاحبزادہ صاحب کے جانے کے بعد کریم اور اُس کی بیوی میں پھر عزت اور غیرت کے معاملات پر لے دے ہوئی لیکن بالآخر کریم کی بیوی نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دئیے کہ تعلقات محبت کے معصوم کھیل سے آگے نہیں بڑھیں گے اور صاحبزادہ گاؤں والوں کی نظروں سے بچ بچا کر آیا کریں گے۔ اس کے باوجود جب کریم صاحبزادہ صاحب سے خیرات وصول کرتا، تو صدیوں سے ورثے میں آئی ہوئی غیرت چیخ اٹھتی۔ اُس کا ضمیر تلملاتا اور کئی بار اُس کے آنسوؤں کا گرم لاوا اس کے حواس کو جلا کر راکھ کر دیتا۔ اور وہ کہتا "آسمان سے بجلی بھی نہیں گرتی کہ یہ بے غیرت جسم بھسم ہو کر رہ جائے"۔ اور ہر ملاقات پر صاحبزادہ صاحب کی بے باکیاں بڑھتی چلی جاتیں لیکن نہ آسمان سے بجلی گری، نہ زمین کا سینہ شق ہوا کہ وہ اُس میں سما جاتا۔

اور نور پور کے چھوٹے سے گاؤں میں صاحبزادہ صاحب کی ملاقاتیں خفیہ نہ رہ سکیں۔ ہوا کا ایک سانس چنگاری کو اڑا لے گیا اور جنگل میں آگ لگ گئی۔ خوفناک شعلے لپکے اور پھر سخی پور کے بڑے پیر صاحب بھی ان شعلوں کو نہ بجھا سکے۔ انہوں نے کہا "نور پور والو! تم سوئے ہوئے تھے۔ تمہارے گاؤں میں تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہوتا رہا اور تم کچھ نہ کر سکے۔ اگر تم صاحبزادہ کی ذلیل گردن مروڑ دیتے تو میں کہتا کہ

تم نے مردوں کا سا کام کیا۔ اگر اب صاحبزادہ تمہارے گاؤں میں قدم رکھے تو اپنا انتقام لینے میں میرا ذرا بھر لحاظ نہ کرنا۔ اس نے صدیوں کی خاندانی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اس کا وجود زمین کے سینے پر بوجھ ہے۔" پیر صاحب آگ بگولا ہو کر اتنا تو کہہ گئے لیکن جب غصہ فرو ہوا تو کانپ گئے۔ "اگر کوئی غیرت مند ہاتھ صاحبزادہ پر اٹھ گیا تو کیا ہوگا۔ ۔ ۔ کیا ہوگا؟" اور وہ رات کو دیر تک مصلے پہ بیٹھ کر دعائیں مانگتے رہے کہ خدا انہیں اتنی بڑی آزمائش میں نہ ڈالے۔

دو چار دن کے بعد نور پور والوں نے کریم کو نور پور سے بھی نکال دیا۔ اب کریم کے سامنے لق و دق صحرا تھا اور کوئی پناہ کی جگہ نہیں تھی۔ اُس کی بیوی نے کہا "میرے میکے میں چلو۔ شاید ہمیں وہاں رہنے کا ٹھکانہ مل جائے اور ایک دن شام کے وقت کریم، اُس کی بیوی اور رشیداں نور پور سے نکلے تو کریم کی بیوی رو رہی تھی۔ کریم خود اپنی لگائی ہوئی آگ میں جل بھن کر بھسم ہو چکا تھا اور رشیداں کی دوشیزگی کو لوٹ چکی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے شعلے سرد تھے۔ اُس کا دل پتھر کا ایک ٹکڑا بن چکا تھا۔ اُس نے سر جھکا کر اپنی خوف ناک تقدیر سے خاموش سمجھوتہ کر لیا۔

سسرال والوں نے کریم کو بادل نخواستہ قبول تو کر لیا لیکن رشیداں کے ماموں نے کہا "کیوں کریم تم اپنے منہ پر کالک مل کر ہماری عزت کو بھی خاک میں ملانے کے لئے آئے ہو؟"

"مجھے اور ذلیل نہ کر رحمے۔ تو ہی بتا اب میں کہاں جا کر منہ کالا کروں؟"

رشیداں کے منگیتر نے رشیداں کو ایک نظر دیکھ کر اپنی ماں سے کہا "ماں! تم نے بہت جلدی کی۔ نہ سہرے بندھے۔ نہ برات چڑھی اور تو ڈولا گھر لے آئی۔ ماں! اس گندگی کے ٹوکرے کو کسی گھورے پر پھینک دے۔"

اور رشیداں کی زندگی کا وہ دور شروع ہو گیا جس میں نہ جنت کے خنک سائے

ہوتے ہیں، نہ جہنم کے شعلے - راکھ کے انبار ہوتے ہیں۔ بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیر۔ زندگی میں جلی ہوئی مٹی کا ذائقہ رچ جاتا ہے۔

چند دن بعد شیداں کی ممانی کی زبان سے طعنوں اور مہنوں کے تیر چلنے لگے۔ وہ کہتی "میں اس ڈائن کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی - یہ میرے گھر کو کھا جائے گی - ایسی منحوس چڑیلوں سے تو موت بھی دور بھاگتی ہے" اور ممانی کی بس بھری نظریں ہر لمحے شیداں کے پیچھے لگی رہتیں - لیکن یہ تیر شیداں کے دل کے پتھر سے ٹکرا کر کند ہو جاتے - شیداں کی بے حسی پر ممانی اور بھی چمک اٹھتیں اور شیداں کی ماں چپکے سے آنسو بہا کر خاموش ہو رہتی۔

اور ایک دن ممانی نے شیداں کے ماموں کے ساتھ تنہائی میں کچھ ایسی بات کی کہ اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی - اُس نے گنڈاسہ ہاتھ میں لے کر کہا "میں اِس کلموہی کا سر کاٹ دوں گا - میں اسے . . . . "شیداں کی ماں نے یہ سُنا تو کلیجہ تھام کر بیٹھ گئی - کریم سخی پور گیا ہوا تھا - وہاں وہ گاؤں والوں کی نظروں سے بچ کر بڑے پیر صاحب سے ملا - انہوں نے سو روپے دے کر بڑی لجاجت سے کہا "کریم جاؤ اور شیداں کے ہاتھ پیلے کر دو - تم اس گھر کے نمک پر پلے ہو - کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو ورنہ اِس گھر کی عزت خاک میں مل جائے گی" اور جب کریم سخی پور سے واپس آیا تو شیداں کے ماموں نے کہا "کریم! تو میرے گھر سے شیداں کو لے کر نکل جا - میں غریب ہوں پر تیری طرح بے غیرت نہیں - عزت جان سے بھی پیاری ہوتی ہے - اگر تو یہاں رہا تو میں شیداں کا سر کاٹ کر پھانسی پر چڑھ جاؤں گا"

کریم نے اپنے سسرال کا گاؤں بھی چھوڑ دیا - اب وہ سخی پور سے پندرہ کوس دور کے ایک گاؤں میں چلا گیا جہاں ابھی کریم کی بے غیرتی کی شہرت نہیں پہنچی تھی۔

چھ ماہ گذرنے کے بعد وہ پیر صاحب سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ دوسرے دِن عُرس تھا اور پیر صاحب اُسے دھتکار کر اپنے حجرے کے پُرسکون تقدّس میں محصور ہو چکے تھے۔" میں اس بے غیرت کمینے کے لئے قارون کا خزانہ کہاں سے لاؤں؟" انہوں نے سوچا" میں اس کی مصیبتوں کا ذمہ دار نہیں۔ بے شرم خود تو ہاتھ پاؤں ہلانا عار سمجھتا ہے۔ اگر صاحبزادہ کو اپنے ہاں آنے سے روک سکتا تھا تو مجھے وقت پر کیوں نہ بتا دیا؟" اس کے باوجود پیر صاحب رات بھر بے چین رہے۔ تہجد کی نماز میں یکسوئی غائب رہی۔ صبح کی نماز بھی خلافِ معمول بے کیف رہی اور وہ درود وظائف میں کئی بار تسبیح کا شمار بھی بھول گئے۔ ایک عجیب سا خوف طاری رہا جس میں آنے والی مصیبت کے سائے تھے۔ لیکن عُرس کے دن کی صبح بڑی شوخ، بڑی پاکیزہ اور بے انتہا حسین تھی۔ دھوپ میں نرم نرم حرارت کی گھلاوٹ تھی۔ چارسُو تقدّس کی نورانی بارش ہو رہی تھی۔ پیر سخی بادشاہ کے مزار کا سفید گنبد دور دور تک ضیا پاشیاں کر رہا تھا۔ اردگرد حدِّ افق تک سرسبز کھیت جھوم رہے تھے۔ اور مزار کے سامنے کے میدان میں لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ رات ہی رات میں بازار لگ چکا تھا۔ جھولے اور ہنگوڑے کُوں کُوں کر رہے تھے۔ یہ کایا پلٹ دیکھ کر پیر صاحب کی طبیعت کا انبساط عود کر آیا۔ پنڈال کے عین وسط میں تکیے کے سہارے بیٹھ کر انہوں نے عرس کا مشاہدہ کیا۔ پنڈال آہستہ آہستہ بھر رہا تھا۔ مرید آ رہے تھے اور ان کے گھٹنوں کو چھو کر ملنے میں دوزانو ہو کر بیٹھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ہر ایک سے خیریت کے دو لفظ پوچھ لیتے۔ کسی کو دعا دیتے۔ کبھی کبھار مسکرا دیتے اور اُن کی مسکراہٹ مجمع میں خوشبو کی طرح بکھر جاتی۔ وقتاً فوقتاً معرفت کے چند مسائل بھی زیرِ بحث آتے۔ شریعت اور طریقت کی آویزش۔ جذب و سلوک کی منزلیں۔ جبر و اختیار کی لاینحل گتھیاں۔ اولیا

اللہ اور مجذوب دیوانوں کی کرامتیں اور خوارقِ عادات ۔ تجربیں کھوئے ہوئے سالکین کی دلچسپ حکایات ۔ قطب اور ابدال کے درجے میں لطیف سا امتیاز ۔ یہ گفتگو ہر پہلو سے جاذب توجہ تھی اور پیر صاحب کریم کو قطعاً محو کر چلے تھے اور کریم اس مجمع میں موجود بھی نہیں تھا ۔ ایک چہرہ دیکھ کر پیر صاحب کو شبہ ہوا کہ یہ کریم ہے اور اُن کی زبان پر آیا ہوا لفظ تردید گی میں بھٹک گیا لیکن دوسرے لمحے ان کا شبہ دور ہوا تو الفاظ پر موتیوں کی قمل تکنے لگے ۔

جب پنڈال بھر گیا تو قوالوں کو اجازت ملی کہ روح کے ساز پر مضراب معرفت کی چوٹ لگائیں ۔ قوالوں نے ساز درست کئے ۔ طبلے پر تھاپ پڑی ۔ ہارمونیم کے سر پیچئے ۔ سارنگی کے تار جھنجھنا ئے تو پنڈال میں تل رکھنے کو جگہ نہ رہی ۔

حمدِ باری تعالٰے اور نعتِ رسولؐ کا کیف بکھرا ۔ فارسی اور اردو غزلیات کا دور شروع ہوا لیکن یہ تغزل دیہاتی طبقے کے مزاج کے موافق نہیں تھا ۔ اس لئے تھوڑی دیر بعد جب ہیر وارث شاہ بلھے شاہ اور خواجہ فرید کی کافیوں مولوی غلام رسول کی یوسف زلیخا اور میاں محمد کے سیف الملوک کے دور کا آغاز ہوا تو مجمع جھوم اٹھا ۔ چند لوگوں پر حال اور وجد کے دورے پڑے اور قوالوں پر روپوں کی بارش ہوئی ۔ قوالی کے بعد دوپہر کا لنگر تقسیم ہوا ۔ ظہر اور عصر کے درمیان ایک واعظِ شیریں مقال پنجابی میں سرودِ معرفت بکھیرتے رہے ۔ اور اس دوران میں نوجوانوں کا ٹولہ مزار کے پاس ایک کھیت میں جہاں نیا نیا ہل چلا تھا ۔ جمع ہو چکا تھا ۔ اس ٹولے کے سردار صاحبزادہ صاحب تھے ۔ یہاں کبڈی کا مقابلہ ہوا کشتیاں لڑی گئیں ۔ کلائیاں پکڑ کر زور آزمائیاں کی گئیں اور کئی بار سخی پور اور رحیم پور والوں کے ہاتھ لاٹھیوں پر پہنچتے پہنچتے رک گئے ۔ ایسے میلوں میں لاٹھیاں نہ چلیں ، تھوڑا سا خون نہ بہے اور ایک دو سر نہ پھوٹیں تو پنجابی خون کی گرمی کو خفت جاتی

حاصل نہیں ہوتا۔

عصر کے بعد اور مغرب سے پہلے چوہدری ہیبت خاں کے گھر سے مزار کی چادر کا جلوس برآمد ہوا۔ سخی پور میں یہ رسم قدیم سے چلی آرہی تھی کہ عرس کے موقع پر مزار کی چادر ہمیشہ گاؤں کے سب سے بڑے چوہدری کے گھر سے آتی۔ جلوس کے آگے آگے قوال سید سخی بادشاہ کی مدح میں منقبت گاتے ہوئے آرہے تھے۔ پیچھے پیر صاحب تھے اور اُن پر سبز عَلم کا سایہ تھا اور اُن سے پیچھے سفید پوش چوہدریوں کا جلوس تھا۔ جو چادر اور تبرک سر پر اُٹھا کر لارہے تھے۔ سخی بادشاہ کے مزار کے تعویذ کو سبز ریشمی چادر سے ڈھانک کر دعا کے فاتحہ پڑھی گئی تبرک تقسیم ہوا اور عرس ختم ہو گیا۔

سورج مغربی اُفق پر تیر کر ڈوب گیا تو سخی بادشاہ کے مزار پر ہُو کا عالم چھا گیا اور نوچندی جمعرات کا چاند معصوم سی مسکراہٹ لیے ہوئے نمودار ہوا۔ اندھیروں اور اُجالوں میں مختصر سی کشمکش ہوئی اور اس کشمکش میں گنبد کی سفیدی پھیکی پڑتی چلی گئی اور عشا کی اذان نے بھر تھرا کر خاموشیوں کو اور گہرا کر دیا۔ نماز پڑھ کر وہ مزار پر آ گئے۔ اُنہوں نے روز کے معمول کے مطابق دعائے فاتحہ پڑھی۔ مزار کے سرہانے سے صندوقچی اُٹھائی۔ اس صندوقچی میں دن بھر کے چڑھاوے کی رقم تھی۔ صندوقچی لے کر پیر صاحب باہر نکل آئے اور مزار کو کنڈی لگا دی۔

لیکن باہر جہاں پھیکی چاندنی کے ساتھ درختوں کے سائے اُلجھ رہے تھے اُن کے دل پر ایک عجیب و غریب غم کا بوجھ پڑا۔ انہوں نے سوچا کہ ہر ہنگامے کے بعد یہ کیفیت ضرور دل کا بوجھ بنا کرتی ہے۔ مجھے اس سے خائف نہیں ہونا چاہیے۔ پھر میں تھک بھی تو گیا ہوں لیکن ان تسلیوں کے باوجود اطمینانِ قلب کی وہ منزل نہ آئی جہاں ہر خوف، ہر اندھیرا، ہر پریشانی سکون کا ریشمی لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ بستر کی نرمی

اور اندازہ میں بھی وہ اس بوجھل ہاتھ کو محسوس کرتے رہے۔ نیند آئی لیکن ہر کروٹ کے ساتھ عجیب و غریب بے سروپا خوابوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ان خوابوں میں تسلسل نہیں تھا۔ اُلجھے ہوئے خواب بھی بھیانک نہیں تھے اور اِن میں خوف کا وہ نقطۂ عروج بھی نہیں تھا کہ رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

وہ تہجد کی نماز کے لئے معمول سے پہلے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے خشوع و خضوع اور وردو وظائف میں پناہ لی۔ تسبیح کی گردشوں کا کوئی شمار باقی نہ رہا لیکن غم کا بوجھل ہاتھ ایک لمحے کے لئے بھی اُن کے دل سے دور نہ ہوا۔ وہ صبح کا انتظار بھی نہ کر سکے اور مسجد میں پہنچ گئے۔ مسجد تنہا اور خالی تھی۔ اندر مٹی کا مدھم دیا جل رہا تھا۔ روشنی پھیکی اور اُداس تھی۔ سرسوں کے تیل کی جلی ہوئی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لَو تھرتھرا رہی تھی۔ وہ مسجد سے نکل آئے اور انہوں نے مزار کا رُخ کیا۔ مزار کے گنبد کی سفید چمک زندگی سے خالی تھی۔ تاروں کی روشنی کا غبار گنبد پر چھایا ہوا تھا لیکن اس کی چمک میں لاش کے زرد چہرے کی بھیانک کیفیت تھی۔ وہ کانپ کر آگے بڑھے لیکن پھر ڈر کر پیچھے ہٹ آئے۔ یہ پہلی بار تھی کہ وہ مزار کے نزدیک جانے سے جھجکے۔

مزار کے خادم نے اپنے حجرے سے باہر نکل کر پوچھا "کون ہے؟"

"م... م... میں..." پیر صاحب نے سر سے پاؤں تک لرز کر کہا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا "میں ہوں" خادم نے پیر صاحب کی آواز پہچان لی۔ وہ آگے آیا اور اُس نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا "یا پیر! یہ خواب کی بات ہے یا میرا وہم۔ مجھے آدھی رات کو مزار کے اندر سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ پر سرکار جب میں حجرے سے باہر نکل آیا تو یہ آواز بند ہو گئی۔"

"بچے کی آواز" پیر صاحب اس اچانک انکشاف پر سُن ہو کر رہ گئے۔ اُن کی آواز پاتال

میں ڈوب گئی ۔ شدّتِ خوف سے اُن کی ٹانگیں کانپیں اور وہ ایک درخت کے تنے کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے ۔

"پہلے یا دوسرے دن کے بچّے کی آواز پیر بادشاہ!"

"نہیں ... نہیں ..." انہوں نے اپنے آپ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا "یہ تمہارا واہمہ ہے .... مزار کے اندر سے! ... نہیں ... نہیں ... تو رات بھر خواب دیکھتا رہا۔"

"پر سرکار اسمٰی بادشاہ زندہ پیر ہیں ۔ یہ اُن کی کرامت ہے۔"

"لیکن انہیں بچّے کی طرح رونے کی کیا ضرورت پیش آئی ۔ تو بے سرو پا واہموں کو بزرگوں کی کرامت سمجھ رہا ہے۔"

اور لیکا یک ایک تارا ٹوٹا ۔ اندھیروں کا غبار روشن ہوا اور ایک تیز شعاع گنبد پر پڑی ۔ گنبد کی سفیدی یک دم چمکی اور پیر صاحب اس مافوق الفطرت چمک سے ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے اور پھر اچانک ایک نوزائیدہ بچّے کی ننھی سی آواز فضا کی خاموشیوں کا سینہ چاک کر کے اُبھری اور تھرتھرائی اور ایک لمحے کی مختصر اڑان میں فضا کی گھمبیر خاموشیوں میں ڈوب گئی ۔ پیر صاحب کے جسم و روح کی ہر رگ جھنجھنائی اور پھر فضا کے سرد اور بے جان اندھیروں کا ایک جزو بن گئی ۔ اُن کے قدم نہ زمین پر تھے اور نہ آسمان پر ۔ وہ خلاؤں میں تحلیل ہوئے اور اُن کے گرد و پیش کی ہر مادی شے اُن کے ساتھ اس گھمبیرتا میں ڈوب گئی ۔ آسمان کے سارے تارے ٹوٹ کر غبار بن گئے اور زمین بھک سے اڑ کر اس غبار میں حل ہو گئی .... ننھی سی آواز کی دوسری لرزش نے کائنات کو یکجا کیا ۔ ستارے اُڑ کر آسمان کی طرف لوٹ گئے ۔ بکھری ہوئی راکھ سمٹی اور درختوں اور گنبد کے ہیولے اُبھرے ۔ روشنی کے دھبّوں نے پھر ستاروں کی شکل اختیار کی ۔ گنبد کی سفیدی پر ایک اور ٹوٹنے والے تارے کی تیز شعاع پھر منعکس ہوئی

اور پیر صاحب نے قیامت کے بعد زندگی کے اس نئے جنم پر آنکھیں ملیں اور جذبات سے گلوگیر آواز میں تیز تیز کہا "جاؤ! چیخ چیخ کر اعلان کر دو کہ سخی بادشاہ زندہ پیر ہیں - لوگو آؤ اور ان کی کرامت کو آنکھوں سے دیکھو۔"

خادم نے گاؤں کی طرف ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ پیر صاحب کی جذباتیت نے یکایک عقل باشعور کا روپ دھار کر کہا "ابھی نہیں..... ابھی تحقیق کی ضرورت ہے۔" اور انہوں نے خادم کو آواز دے کر روک لیا۔ خود قرآن کی آیات پڑھ کر اپنے آپ پر دم کیا اور جرأت پا کر مزار کا رُخ کیا - انہوں نے کلبلتے ہاتھوں سے مزار کی کنڈی کھولی - دروازہ چرچرایا - اندر دیئے کی لو ٹمٹمائی اور ہوا کے ایک جھونکے سے لرز کر بجھ گئی - پیر صاحب اندھیرے میں آگے بڑھنے سے ہچکچائے - انہوں نے خادم سے پوچھا "تمہارے پاس روشنی ہے... دیا سلائی ہے؟"

"نہیں سرکار..... طاقچے میں دیا سلائی ضرور ہو گی۔"

پیر صاحب ڈرتے ڈرتے مزار کے اندر داخل ہوئے ٹٹول ٹٹول کر طاقچہ تلاش کیا اور ڈبیا نے ان کی انگلیوں کو مس کیا - دیا سلائی کی رگڑ سے جو ننھا سا شعلہ پیدا ہوا وہ لرز کر بجھ گیا - لیکن روشنی کے اس قلیل سے وقفے میں حقیقت کا چہرہ دوپہر کے سورج کی طرح چمک گیا - یہ دوسرا ناگہانی صدمہ تھا - لیکن پیر صاحب کی قوت برداشت نے اسے بہت جلد قبول کر لیا - انہوں نے دھیرے سے کہا "جاؤ..... بیبے خان کو بلا لاؤ لیکن....!" انہوں نے پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں پر سوکھی زبان پھیری "اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

اور پھر دو چار لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے اپنے آپ سے کہا "اب میں کیا کروں؟ صدیوں کی خاندانی عزت خاک میں مل گئی ہے..... نمک حرام نے کتنا خوفناک انتقام لیا ہے!..... خوفناک.....!"

خداحافظ

اُس کے لئے کسی لڑکی کو پڑھانے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ شاید پہلی بار جب وہ کسی غیر لڑکی کے ساتھ تنہائی میں بیٹھا ہوگا تو اس کا دل بھی دھڑکا ہوگا۔ اور پیشانی بھی پسینے سے تر ہو گئی ہوگی لیکن اب رومان اور ارمان کے دن گذر چکے تھے۔ اسے اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس تھا۔ اب وہ شوہر تھا الدبچوں کا باپ۔ پڑھانا اس کا پیشہ تھا اور اسے اپنے کردار پر پورا پورا اعتماد تھا۔ اُس نے ایسی لڑکیوں کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر کئی کئی گھنٹے صرف کئے تھے۔ جن کی بات بات میں شرارت اور رگ رگ میں شرارے بھرے ہوئے تھے۔ اور اس نے نسائیت کی تمام دلکشیوں سے آنکھیں بند کر اپنے فرائض کو ادا کیا تھا۔ اب وہ پختہ کار تھا۔ اس نے بلاجھجک کمرے کے اندر قدم رکھا اور دروازے کے نزدیک دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے چھوٹی سی تپائی تھی اور تپائی پر لیمپ جل رہا تھا۔ کمرے میں دری اور دری پر قالین تھا کرسیاں اور صوفے قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ نئی قلعی کی ہوئی دیوار پر کچھ تصاویر بھی تھیں۔

اُس نے کمرے کا سرسری جائزہ لے کر آنکھیں بند کرلیں۔ سارا دن مغز کھپائی کرنے کے بعد اُسے ذہنی کوفت کا شدید احساس ہو رہا تھا اور دو منٹ کے بعد جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے دوسری کرسی پر اُس کی نئی شاگرد وہ بھی سکڑی بیٹھی تھی۔ اُسے عجب

معمول کوئی ذہنی دلچسپی محسوس نہ ہوا۔ اُس نے خشک، بے کیف آواز میں کہا "میرا طریقہ یہ ہے کہ پڑھائی شروع کرنے سے قبل شاگردوں کا مختصر سا امتحان لیا کرتا ہوں تاکہ مجھے پتہ چل سکے کہ ان میں کون کون سی کمی ہے اور اسے کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔" اس کی شاگردہ کانپ گئی وہ اس فوری امتحان کے لئے تیار نہیں تھی۔ اُس کے بھینچے ہوئے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کھلے اور پھر بند ہو گئے۔ اُس نے لڑکی کی کاپی لی اور اُس پر ایک فقرہ لکھ کر کہا "اسے روایت معنوی میں بدل دیجیے۔"

"روایت معنوی؟" لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا اور پھر اُن بڑی بڑی آنکھوں میں رم کردہ آہو کی وحشت بھر گئی۔

"جی روایتِ معنوی۔ یعنی میرا مطلب ہے ان ڈائرکٹ نریشن (INDIRECT NARATION)"

"ج۔۔۔۔ج۔۔۔۔جی میں نے یہ قاعدہ نہیں سیکھا" لڑکی نے بڑی لجاجت سے کہا۔ اُس نے دوسرا فقرہ لکھا اور کہا "اس کی ترکیب نحوی کر دیجیے۔"

"ترکیب نحوی؟" لڑکی نے پھر گھبرا کر کہا "میں یہ بھی نہیں جانتی۔"

اس نے امتحانی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک کے بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔ مشکل سوالات آسان بنتے گئے اور آسان، آسان تر لیکن اس کی طالبہ ایک جواب بھی نہ دے سکی اور ہر سوال کے ساتھ اس کی گھبراہٹ بڑھتی رہی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں چھائی ہوئی وحشت میں اضافہ ہوتا رہا اور وحشت مایوسی میں اور مایوسی غم اور پچھتاوے کی تاریکیوں میں ڈوب گئی۔ پھر ان تاریکیوں میں سے آنسوؤں کا غبار پیدا ہوا اور آنسوؤں کے غبار سے پانی کے قطرے ٹپک پڑے۔ وہ قطرے جنہیں پلکوں نے روک لیا اور جنہیں دوپٹے کے پلّو نے بہنے سے پہلے ہی خشک کر دیا۔ اس نے ان حساس آنسوؤں کو نہ دیکھا۔ اس نے کاپی بند کر دی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اُس نے سوچا۔

"ایک استاد کو کتنے کند ذہن اور غبی شاگردوں سے پالا پڑتا ہے ۔ امتحان میں تین ماہ رہ گئے ہیں میرے پاس الہ دین کا چراغ تھوڑا ہی ہے کہ ممکن کو ناممکن کر دکھاؤں ۔"

"لیکن تمہیں کیا ۔ ایک گھنٹہ پڑھاؤ اور مہینے کے آخر میں مزے سے ٹیوشن کی رقم وصول کر کے دوسرا مہینہ شروع کر دو ۔"

خیالات کی رو بدلتے ہی اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں اور کہا ۔

"گرامر کی کتاب مجھے دے دیجئے ۔" لیکن اس کی آواز کمرے میں مدھم سی گونج پیدا کر کے خاموش ہو گئی ۔ دوسری کرسی خالی تھی ۔ "آپ کہاں گئیں ۔" اُس نے ذرا اونچی آواز میں کہا ۔ کمرے کے دوسرے دروازے سے وہی بزرگ داخل ہوئے جنہوں نے اُسے ٹیوشن کرنے کو کہا تھا ۔

"ماسٹر صاحب ! رفی بہت حساس لڑکی ہے ۔ آپ کے سوالوں سے گھبرا گئی ہے ۔ اُسے کچھ موقع دیں ۔ آپ کوشش کیجئے ۔ رفی ذہین ہے جلد کمی دور کر لے گی ۔" رفی جو اپنے والد کے پیچھے آڑ لے کر کھڑی تھی ۔ پھر اُس کے سامنے بیٹھ گئی ۔ اس نے گرامر کا سبق دیا ۔ حساب کا ایک قاعدہ سکھایا اور اٹھ کر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ۔

"ایک گھنٹہ گزر گیا ہے" اور دروازے کی طرف گھوما ۔ پھر اُسے خیال سا آگیا اس نے اچانک مڑ کر کہا ۔

"آپ کا پورا نام کیا ہے ؟"

"رفعت سلطانہ ۔"

باہر اندھیرا تھا ۔ وہ برآمدے میں ٹھٹکا ۔ وہ ایک ہی دن میں مکان کی تفصیلات ۔ برآمدوں میں باہر جانے والے راستے سے کس طرح واقف ہو سکتا تھا پھر یکایک روشنی کی مدھم سی لکیر نے اُس کے راستے کی تاریکی کو دور کر دیا ۔ اُس نے مڑ کر دیکھا ۔ رفعت سلطانہ اس کے پیچھے برآمدے میں لیمپ لے کر کھڑی تھی ۔ باہر گلی میں

پہنچ کر اُس نے سوچا" میں نے رفعت سے کہا تو نہیں تھا کہ مجھے روشنی دکھاؤ۔
اور اس کے دل کے ایک کونے میں روشنی کی ایک ننھی سی کرن تھرک گئی۔ محض ایک
ننھی سی کرن۔ یہ احساس اتنا لطیف تھا کہ لمحے کے ہزارویں حصّے سے کم وقفے کے
لئے بھی زندہ نہ رہ سکا۔

دوسرے دن کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ تھوڑا سا ٹھٹکا۔ نہ جانے کیوں؟
اُس نے کرسی پر بیٹھ کر رفعت سلطانہ کا انتظار کیا۔ یہ انتظار جو معمول کے خلاف میٹھا
اور کیف زا تھا۔ لیکن یہ کیفیت محض چند لمحوں کے لئے طاری رہ سکی۔ رفعت سلطانہ
سامنے کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ اور اس کے اندر کا 'ذمہ دار استاد' بیدار ہو چکا تھا۔
وہ انسان جس نے خلافِ معمول انتظار کا تھوڑا سا لطف اٹھایا' نہ جانے شرما کر کون سے
پردوں کے پیچھے پناہ لینے کے لئے چھپ گیا تھا!

رفعت نے کل کا سبق سنایا اور اس کے شرمیلے حساس چہرے پر کامیابی کی سرخی پھیلی اور
پھر دوسرا سبق لیتے وقت رفعت کا رویّہ کل کی نسبت زیادہ پُر اعتماد رہا۔ اُسے خوشی محسوس
ہوئی۔ اُس نے سوچا۔

"وہ لڑکی ذہین ہے۔ جلد کمی دور کرلے گی۔ ابھی تین ماہ باقی ہیں"
اُس نے چاہا کہ رفعت سلطانہ سے اپنے تاثر کو بیان کر دے لیکن لفظ اُس کے ہونٹوں
پر آ کر ٹوٹ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ حوصلہ افزائی محنت اور کامیابیوں کا زینہ ہوتی ہے
اس کے ایک چھوٹے سے تعریفی جملے سے رفعت کی کئی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو سکتی
ہیں لیکن یہ جملہ اس کے ذہن میں کلبلاتا رہا ہونٹوں پر نہ آسکا۔ حتیٰ کہ سبق ختم ہو گیا۔
اور وہ اندھیرے برآمدے میں آ گیا۔ پھر رفعت سلطانہ کی شمع جھلملائی اور اس کے دل کے
کسی کونے میں پھر ایک جگنو سا چمکا اور گلی میں پہنچ کر یہ روشنی پھر ختم ہو گئی اور

اُسے ایک قسم کی ندامت کا احساس ہوا" کیا مجھے رفعت سلطانہ کا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہیئے تھا؟"

وقت اپنے معمول کے مطابق گذرتا رہا۔ لمحے ساعتوں میں بدلتے رہے۔ ساعتیں گھڑیوں میں جذب ہوتی رہیں۔ پھر مہینہ ختم ہو گیا۔ یہ مہینہ جس کے لمحے رینگ رینگ کر بڑھتے ہیں اور ایک ابدیت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ مہینہ اتنی جلدی ختم ہو گیا کہ اُسے احساس بھی نہ ہوا کہ آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔

اُس نے سبق ختم کیا اور اٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ رفعت سلطانہ نے کہا" ابا جان آپ سے ملنا چاہتے ہیں"۔ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ رفعت کرسی سے اٹھی اور اس کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی" میں بھی آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں"۔

اُس نے رفعت کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ رفعت نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ دو بڑی بڑی شرمیلی آنکھیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے ان آنکھوں کی وادیوں میں آوارہ ہو گیا۔ کھڑی ہوئی دراز قد رفعت اُسے مانوس نظر آئی جیسے آج سے کئی صدیاں قبل ایک دوسرے سے ملے تھے اور پھر زندگی کے اس موڑ پر ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے جہاں سے سینکڑوں دوراہے اور ہزاروں پگڈنڈیاں پھوٹتی تھیں اور آج ایک لمحے کے لئے محض ایک ثانیے کے لئے پھر مل گئے تھے۔ اور اس کی روح کے اندر کسی نے چیخ کر کہا" میں نے تمہیں پا لیا ہے تم کون ہو"۔ اور یہ چیخ اس کے ہونٹوں پر پہنچنے سے پہلے مر گئی" میں رفی ہوں"۔ اس نے رفعت کی آواز سنی اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ وہیں پہنچ گیا جہاں سے وہ چلا تھا۔

" آپ نے کیا کہا؟"

" آپ بھی مجھے رفی کہا کریں۔ آپ مجھے رفعت کہتے ہیں تو یہ نام مجھے اجنبی سا معلوم ہوتا ہے"۔ اُس نے پھر نگاہیں اٹھا کر رفی کو دیکھا۔ لیکن رفی اب کمرے سے

چلی گئی تھی ۔ اور اس کے فوراً بعد رِفّی کے ابّا جان کمرے کے اندر آگئے تھے ۔ اُس نے ان کے ساتھ ہاتھ ملایا ۔ رِفّی کے ابا جان نے رِفّی کے متعلق پوچھا ۔ اُس نے رِفّی کی ذہانت اور محنت کی تعریف کی ۔ رِفّی کے والد نے اُسے ٹیوشن کی رقم دی اور اس نے بغیر گنے نوٹ اپنی جیب میں ڈال لئے ۔ اور پھر کمرے سے باہر چلا آیا ۔

آج اُسے راستہ دکھانے کے لئے رفّی کی شمع روشن نہ ہوئی ۔ برآمدے میں اندھیرے کا سیلاب امنڈ آیا ۔ آج اس کے دل کے کونے میں کوئی جگنو نہ ٹمٹمایا ۔ آج جیسے ساری دنیا کی روشنیاں بجھ گئیں ۔

پھر رفعت اور اُس کے درمیان تکلّف کی سنگین دیواریں حائل ہو گئیں ۔ وہ رفعت کو رفّی نہ کہہ سکا ۔ ضرورت پڑنے پر وہ رفعت کو "آپ" کہہ کر مخاطب کر لیتا ۔

"آپ نے کل یہ قاعدہ سیکھا تھا ۔ اُسے آج کے سبق میں استعمال کر لیجئے نا!"

"آپ پھر بھول گئیں ۔"

"دیکھئے نا! آپ پوری توجہ نہیں دے رہیں ۔"

لیکن اس اجتناب کے باوجود اُسے رفعت سے ایک اجنبی سے قرب کا احساس ہو رہا تھا ۔ یہ قرب جو اس کی روح کی کسی گہرائی میں پیدا ہوا ۔ لیکن اس کے شعور نے اُسے محسوس کرنے سے انکار کر دیا ۔ اس کی لطافت ۔ احساس کا اتنا سا بار بھی برداشت نہ کر سکتی تھی ۔ اُس نغمے کی طرح جسے موسیقار کی روح نے محسوس کیا لیکن مضراب کی چوٹ اُسے وجود میں نہ لا سکی ۔

اُسے ٹیوشن کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ایک مدّت گذر گئی تھی ۔ مقررہ وقت ختم ہو جانے پر اُسے گھڑی دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی ۔ اس کے اندر خود بخود ایک بے چین سا احساس پیدا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کھڑا ہو جاتا ۔ گھڑی دیکھ کر کہتا ۔

"ایک گھنٹہ ہو گیا ہے ۔ مجھے اب جانا چاہیئے" لیکن رفعت کے ہاں آہستہ آہستہ یہ اصول بھول گیا ۔ ایک گھنٹہ گزرتا اور پھر سوئی اگلے گھنٹے کی منزلیں طے کرنے لگتی ۔ لیکن وہ پڑھانے میں مصروف رہتا حتےٰ کہ رفعت تھک جاتی اور اس کی آنکھوں میں نیند جھلکنے لگتی ۔

"آپ توجہ نہیں دے رہی ہیں"

رفعت ادھ کھلی آنکھوں سے اُسے دیکھتی ۔ پھر تھکی ہوئی نگاہیں کھلے ہوئے صفحے پر پھیل جاتیں اور بہت دیر کے بعد صفحے پر سطریں اور سطروں پر لفظ ابھرتے ۔

"آپ کو نیند آ رہی ہے" وہ چونک کر کہتا ۔

"جی" رفعت بڑی معصومیت سے کہتی ۔ اُس کی نظر کلائی پر جا پڑتی "اُف! ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا ہے ۔ مجھے اب جانا چاہیئے" رفعت لیمپ لے کر تیزی سے اٹھتی اور برآمدے میں پہنچنے سے پہلے رقی کی شمع کی سرخ کرنیں پھیلتیں اور اُس کے دل کا نور جاگ اٹھتا اور دیر تک جھلملاتا رہتا ۔

اُس نے رقی کو کبھی آنکھ بھر کر نہیں دیکھا تھا ۔ سبق کے دوران میں اُس کی نظریں تپائی پر گڑی رہتیں ۔ جہاں کاپیاں اور کتابیں بکھری رہتیں ۔ البتہ کبھی کبھی اُسے رقی کے ہاتھ نظر آ جاتے ۔ یہ ہاتھ جو بھرے بھرے اور سڈول تھے جن کی انگلیوں کے پوسے گلابی دھبے سے معلوم ہوتے تھے اور بس! ۔ اس سے پرے نگاہوں کی منزل ختم ہو جاتی ۔ اس سے پرے کیا تھا؟ یہ سوال کبھی اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا تھا ۔ وہ جب آتا تو رفعت اس سے پہلے کمرے میں موجود ہوتی اور وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ جاتا اور میز پر نگاہیں جھکا لیتا ۔ وہ رقی کے اٹھنے سے پہلے دروازے کی طرف گھوم جاتا اور برآمدے میں رقی سے پہلے پہنچ جاتا ۔

اُس دن اُس کے آنے پر رفی کمرے میں موجود نہیں تھی۔ اُسے مطالعہ گاہ خالی خالی سا معلوم ہوا "رفعت کہاں گئی ہے" اس نے بے چین ہو کر سوچا اور پھر وقت ریڈنگ کر پڑھنے لگا۔ ایک منٹ...... ایک گھنٹہ...... دو منٹ...... دو گھنٹے۔ پھر دوسرے کھلے دروازے سے ایک سایہ لپکا۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔

"رفی" اُس کے منہ سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا۔ اور تکلف کی آہنی دیوار دھم سے گر پڑی۔ رفی رک کر کھڑی ہو گئی۔

رفی کے ہونٹوں پر دھیمی سی لہر پیدا ہوئی اور اُس نے کہا۔

"جی! مجھے دیر ہو گئی"۔ اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

آج اس نے رفی کو سر سے پاؤں تک دیکھ لیا تھا۔ یونہیں! اُسے کوئی ذہنی دھچکا محسوس نہ ہوا۔ اور سبق شروع ہو گیا۔ پھر رفی کی آنکھوں میں نیند کا خمار جھلکا اور اُس کی نظریں سطروں پر بہکنے لگیں۔ رفی نے ہلکی سی جمائی لی اور اُس نے کتاب بند کر کے گھڑی دیکھی۔ پونے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔

برآمدے میں پہنچ کر رفی کی شمع جھلملائی۔ لرزتی ہوئی شعاعوں نے اس کی راہ نمائی کی اور گلی میں پہنچ کر جہاں کمیٹی کا لیمپ گدلی سی روشنی پھینک رہا تھا۔ اُس کے دل میں رفی کی شمع پھر سے روشن ہو گئی۔ اور پھر نور کے پردوں سے رفی تڑپ کر نکلی اور اُس کے دل کی ہر وسعت پر محیط ہو گئی۔ اب اس کے دل کا کوئی کونہ خالی نہ رہا تھا۔ وہاں رفی تھی۔ اور اُس کے ہونٹوں پر تیرنے والی مسکراہٹ۔ متناسب جسم۔ بڑی بڑی سہمی سہمی آنکھوں والی رفی۔ وہ آنکھیں جن میں ذہانت اور احساس کی شدت تھی۔

"میں نے رفی کو پہلے کہیں دیکھا ہے"

"کہاں؟" اُسے اُس کے سوال کا جواب نہ مل سکا لیکن اُس کے اندر سے ذمہ دار استاد نے غیظ آلود چہرے سے باہر جھانکا۔ وہ استاد جو شوہر بھی تھا۔ اور بچوں کا

باپ بھی۔ اُس نے کہا "رفی تمہاری شاگرد ہے۔ تم نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ تمہارا واہمہ ہے اور یہ تصور گناہ ہے" اور وہ انسان جسے چند لمحوں کی آزادی ملی تھی ۔ پھر قفس کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا لیکن اُس کی پیشانی پر شرم کا نم آلود غبار چھا گیا۔

اس دن صبح سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سردیوں کے پتلے پتلے بادل آہستہ آہستہ گھنے ہوتے ہیں۔ اور پھر نہ کھلتے ہیں۔ نہ کھُل کر برستے ہیں۔

سہ پہر سے ایک ایک دو دو قطرے ٹپک رہے تھے۔ ٹپ...... ٹپ...... ٹپ۔ زمین کی سطح بھیگ چکی تھی۔ گلیوں میں کیچڑ تھی۔ لیکن وہ عین وقت پر رفی کے گھر جا پہنچا۔ آج معمول کے خلاف مطالعہ گاہ کا دروازہ بند تھا۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ اندر اندھیرا تھا "رفی کہاں ہیں؟" اُس نے پوچھا۔ نوکر نے کہا "بی بی! اندر ہیں۔ بلا لاؤں ماسٹر جی؟" "ہاں! بلا لاؤ" اور خود وہ اپنی مخصوص کرسی سٹول کر بیٹھ گیا۔ اور پھر دوسرے دروازے سے روشنی ہوئی اور رفی شمع ہاتھ میں لئے ہوئے آگئی۔ رفی اور شمع!

رفی نے مسکرا کر کہا "میں نے سمجھا تھا آج آپ نہیں آئیں گے۔"

"کیوں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بارش اور کیچڑ...... اندھیرا اور سردی"

"میرا فرض تھا اور مجھے آنا پڑا۔ سردیوں کی بارش یوں بھی خوشگوار ہوتی ہے" اُس کا خیال تھا رفی چونک جائے گی اور کہے گی "عجیب بات ہے" لیکن رفی حیران نہ ہوئی اُس نے جھکی جھکی نظروں سے کہا "اس رات جب بارش ہوتی ہے مجھے دیر تک نیند نہیں آتی"

"کیوں ؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یونہی ..... چھت پر بوندیں گرتی ہیں ..... یوں معلوم ہوتا ہے ..... نہ جانے کیا معلوم ہوتا ہے!" رفی اپنے احساس کی کیفیت کو واضح نہ کر سکی۔

"دھیما سا نغمہ" اس نے چمک کر کہا۔

"جی!" رفی نے بڑی بڑی آنکھیں کھول کر کہا۔

سردیوں کی ان گنت راتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چھت پر بوندیں ٹپکیں۔ دھیمے نغموں کے سوتے پھوٹے۔ ٹپ ..... ٹپ ..... ٹپ اور اس کی روح نغموں کے کانپتے تار کے ساتھ رفی کی شاعرانہ حس سے جا ملی۔ یہ نقطہ اتصال تھا۔ دو دھاروں کا سنگم۔ اس کا جسم اس کی روح میں تحلیل ہو گیا۔ اور اس کی روح غیر محسوس نغموں کی غیر مرئی وادیوں میں کھو گئی۔ جہاں پھول کی نکہت آوارہ تھی؛ جہاں رفی کا جسم نہیں تھا جہاں رفی ایک لطیف نغمے میں تحلیل ہو گئی تھی وہ نغمہ جو عرصے سے اس کی روح میں چھپا ہوا تھا۔

پھر اس کی روح پر کھٹ سے اس کے جسم کا بوجھ آ پڑا۔ اس نے گھبرا کر اپنے ماحول پر نظر ڈالی۔ رفی کتاب کھولے کل کا پڑھا ہوا صفحہ دیکھ رہی تھی۔ آج کا سبق شروع ہو چکا تھا۔

فروری کا مہینہ دھیرے دھیرے ختم ہونے لگا۔ اب آسمان صاف تھا اور زمین پر پھول کھل رہے تھے۔ ہرے ہرے کھیت لہرا رہے تھے اور سنہری کرنوں کا رقص شوخ ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن اس کی روح پر کوئی ان دیکھا درد کے بیل بوٹے کاڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ غم بوجھل نہیں تھا۔ وہ درد جس کی تلخیوں میں مٹھاس تھی۔ اس سے پہلے اس نے درد کی یہ ٹیسیں۔ غم کی یہ لہریں محسوس نہ کی تھیں۔ یہ درد نیا تھا۔ یہ غم اس کے لئے

اجنبی تھا۔ جیسے اُس نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ خواب ہو اُسے کسی نئی دنیا میں لے گیا ہو۔ جہاں وادیوں میں پھول نہیں تھے محض رنگ و بو کا طوفان تھا۔ رنگ جو اُڑ رہے تھے اور بُو جیسے آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اور پھر اُسے جھنجھوڑ کر خواب سے بیدار کر دیا ہو۔ خواب ٹوٹ گیا ہو اور اس کی ہلکی سی کیفیت باقی رہ گئی ہو اور پھر وہ کیفیت بھی کھو جائے اور یہ غم مستقل ہو جائے۔ یہ نرالا غم! یہ انوکھا درد!

مارچ کے شروع ہفتے کا پہلا اتوار تھا۔ اُس سے اگلے دن رفی کا پہلا پرچہ تھا۔ وہ معمول کے خلاف آج سہ پہر کو پڑھانے چلا گیا تھا۔ نوکر نے برآمدے میں ہی کرسیاں اور تپائی لگا دی تھیں۔ آج اُس نے ماحول میں اجنبیت محسوس کی۔ رفی اور شمع شاید لازم و ملزوم بن گئے تھے۔ سہ پہر کو بھلا شمع کیوں روشن ہوتی؟

آج رفی کے ہاتھوں میں پھولوں کا گچھا تھا۔ اس نے پھول تپائی پر رکھ دئے۔ اور سبق شروع ہو گیا۔ کل پرچہ تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ کل رفی کا امتحان نہیں تھا۔ اس کا اپنا امتحان تھا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پھر دوسرا ختم ہو گیا۔ اور اُسے محسوس تک نہ ہوا۔ اس نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی سے اٹھتے ہی اُس کی نظر پھولوں کے گچھے پر پڑی۔ وہ پھولوں کا اتنا شوقین نہیں تھا۔ لیکن نہ معلوم کیوں اُسے آج یہ پھول دلفریب نظر آئے۔ اس نے کہا "یہ پھول کتنے خوبصورت ہیں!"

"یہ ایک سہیلی کے ہاں سے لائی تھی۔ اُس کی کوٹھی میں ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے۔ بڑے خوبصورت پھول ہیں۔ آپ کو پسند ہیں کیا؟"

رفی کے چہرے پر یہ سوال کتنا بھلا معلوم ہوا۔

اُس نے اپنی پسند کا اظہار نہ کیا لیکن رفی نے پھولوں کا گچھا اس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے کہا "صرف ایک پھول"۔ رفی نے ایک پھول چھانٹا۔ اس نے پھول کو ڈنٹھل سے

پکڑ لیا۔ اور گلی میں آ گیا۔ اُس نے کوٹ کے کالر کو ٹٹولا۔ وہاں پھول اڑسنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اُس نے پھول کو سونگھا۔ خوشبو اتنی دھیمی۔ اتنی میٹھی۔ اتنی گریزاں تھی کہ قوتِ شامہ کو دھوکا ہوتا رہا کہ آیا پھول میں خوشبو تھی بھی یا نہیں۔ اُس نے پھول کو غور سے دیکھا۔ پھول کا رنگ سفید تھا۔ اور اُس کی ایک پتی پر ایک کنارے میں گلابی رنگ کا ایک بڑا سا دھبہ تھا۔ اور ننھے ننھے گلابی نقطے اس کے آس پاس دور تک پھیل گئے تھے۔ جیسے مصورِ فطرت کے ہاتھ نے بھولے سے سفید کینوس پر رنگ کا ایک چھینٹا گرا دیا ہو۔ صرف ایک چھینٹا۔ اور رفی کا یہ تحفہ اُس کے گردوپیش پر مسرت کا ایک غبار بن کر چھا گیا۔ اس کے قدم گھر کی چار دیواری کی طرف نہ بڑھ سکے۔ اُس کے کانوں پر بازار اور سڑک کا شور و شغب بہت گراں گزرا۔ وہ شہر سے باہر ہرے بھرے کھیتوں میں نکل گیا۔ جہاں شام کی دھوپ سونا بکھیر رہی تھی۔ شام گہری ہو گئی اور کھیتوں کے حسن نے رات کا سیاہ نقاب اوڑھ لیا وہ واپس آیا۔ گھر پہنچ کر اس نے چاہا کہ پھول کو کسی کتاب میں رکھ دے لیکن پھول اس کے ہاتھوں میں نہیں تھا۔ شاید کہیں گر گیا تھا؟ کہاں گرا تھا؟ اس نے سوچا اور اس کی روح پر اداسی کے بادل چھا گئے۔

رفی کا صرف ایک پرچہ رہ گیا تھا۔ رفی کے ساتھ گزارنے والے آخری لمحے ایک ایک کر کے بیتنے لگے۔ اچانک اس کا دل دھڑکا۔ اسے جھٹکا سا لگا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ یہ گھنٹہ اتنی جلدی کیوں گزر گیا؟ اور پھر وقت کو پَر لگ گئے۔ دن لمحے اور لمحے ثانئے بن گئے اور ثانئے ایک ایسی کسرِ اعشاریہ میں ڈھل گئے جنہیں دماغ کی لطیف سی لطیف قوت بھی گرفت میں نہیں لا سکتی تھی۔ تین مہینے آنکھ جھپکنے سے پہلے گزر گئے۔ رفی کے ساتھ گزرے ہوئے تین لمحے۔ یہ تین لمحے جن سے پہلے خلاؤں کی دنیا تھی۔ یہ تین لمحے جن کے بعد خلاؤں کی دنیا تھی۔ یہ تین لمحے جن کے دوران میں رفی پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔

بیتے ہوئے لمحے جو اُس کے حافظے کے خلاؤں میں رفی کی شمع بن گئے تھے ۔ جن کی روشنی میں اُس نے رفی کو پہلی بار دیکھا اور پہچان لیا تھا۔

" میں نے رفی کو پہلے کہیں دیکھا تھا "

" نہیں ۔ رفی خلاؤں کی دنیا میں بس رہی تھی ۔ تم نے خود اُس کی تخلیق کی ۔ اب اُسے خود اپنے بنانے والے ہاتھوں سے خلاؤں کے سمندر میں تحلیل کر دو گے " اُسے دوسرا جھٹکا لگا۔ یہ رفی کا کمرہ تھا ۔ یہ کرسیاں تھیں ۔ یہ صوفے ۔ اُس کے سامنے رفی بیٹھی ہوئی تھیں ۔ رفی کی آنکھیں کتاب پر جھکی ہوئی تھیں ۔ جھکی ہوئی آنکھوں پر پلکوں کے لمبے اور گھنیرے سائے تھے۔ اور . . . . اور رفی کی شمع روشن تھی ۔

وہ اب ایک لمحہ اور رفی کے سامنے نہ بیٹھ سکتا تھا ۔ وہ جلدی سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا ۔ برآمدے میں اندھیرا تھا ۔ رفی چند لمحے پریشان رہی پھر لیمپ لے کر برآمدے میں آ گئی ۔ اُس نے اپنے سامنے روشنی کے دائرے کو پھیلتے اور کانپتے دیکھا ۔ لیکن اس کے دل میں اندھیرا تھا جیسے ساری دنیا کے چراغ بجھ گئے ہوں ۔ وہ گلی میں آ گیا۔ اُسے ٹھوکریں لگیں ۔ اس نے دیواروں سے ٹکریں کھائیں ۔ اور پھر وہ گدلے سے لیمپ کی گدلی سی روشنی میں آ کر یونہی ٹھہر گیا ۔ سامنے سڑک تھی ۔ اور اوپر کھلا آسمان جس پر ان گنت ستارے ڈھلک رہے تھے ۔

ایک ستارہ ٹوٹ کر اس کی بھولی یادوں کی تاریکی میں ٹمٹما اٹھا ۔ اور اس کی نظروں کے سامنے رفی کا دیا ہوا پھول کانپ گیا ۔ وہ پھول جو اُس نے کھو دیا تھا ۔ اُس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سوکھی پتیاں چرچرائیں ۔ اور پھر اس کی دو انگلیوں میں پس کر خاک کی ایک چٹکی بن گئیں ۔ اُس نے خاک کی چٹکی زمین پر پھینک دی ۔ اور اُس نے دھیرے سے سرگوشی کے انداز میں کہا " خدا حافظ " اُسے اپنی آواز پر شک ہوا ۔ یہ آواز کس کی تھی ؟ کیا یہ رفی کی آواز تھی ؟ اس نے

گھوم کر دیکھا۔ رفی کے برآمدے میں اندھیرا تھا۔ رفی کی شمع روشن نہیں تھی۔ رفی نجانے کب کی اندر چلی گئی تھی۔ اور...... پھر اس رات آسمان پر ٹوٹنے والے تمام ستارے اس کی آنکھوں میں ڈھلک آئے۔

وہ لمحہ

نذیر نے میٹرک پاس کرلے کے بعد اپنے قصبے میں منیاری کی چھوٹی سی دکان کرلی۔
اچھی ملازمت سے اُسے نفرت نہ تھی لیکن کلرکی کی گھِس گھِس کو وہ طبعًا ناپسند کرتا تھا اور
ایک میٹرک پاس کی پیشانی پر کلرکی کی مہر گویا ازل سے لگی ہوتی ہے۔ پھر وہ تھوڑا سا
آزادی پسند بھی تھا۔ اور اپنی دکان پر آزادی سے کام کرنے کا اسے پورا پورا موقع حاصل
تھا۔ اس کی طبیعت میں صفائی پسندی بھی تھی۔ دھوبی کے دھلے ہوئے استری شدہ
کپڑے۔ پاپلین کی قمیص گلے میں مفلر۔ بہترین اون کا سویٹر۔ آنکھوں پر رنگین چشمہ۔ سر کے
بال تراشیدہ اور ان میں خوشبودار تیل۔ ٹیڑھی مانگ اور نفاست سے کتری ہوئی ننھی
ننھی مونچھیں شکل و صورت بھی خاصی تھی۔ درمیانہ قد گٹھا ہوا جسم اور بدن جامہ زیب۔

اس کی دکان میں کوئی وافر مال نہیں تھا البتہ جو کچھ تھا وہ دکان میں اس خوبی سے
سجا کر رکھا گیا تھا کہ گاہک ایک نظر ڈال کر دوسرا قدم آگے نہ بڑھا سکتا تھا۔ خوش قسمت
سے اس کے قصبے میں بجلی آگئی تھی۔ اس نے بجلی لگوائی تو سرِ شام ہی اس کی دکان
بقعۂ نور بن جاتی۔ چیزیں الماریوں کے اندر سجی ہوئی تھیں اور الماریوں میں شیشے تھے۔
شیشوں کے پیچھے قمقمے تھے اور ہر قمقمے کا رنگ جدا تھا۔ کہیں نیلا، کہیں سرخ اور
کہیں سبز قمقمہ اپنی بہار دکھا رہا ہوتا۔ اس کا قصبہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ بہت جلد لکھ
پتی بن جاتا اور پھر نذیر کے اندر لکھ پتی بننے والی صفات بھی نہیں تھیں۔ گاہک سے

جھگڑنا اس کی فطرت میں نہیں تھا بلکہ زیادہ باتیں کر کے وہ تھک جاتا اور اکثر مایوس ہو کر گاہک بھی کھو بیٹھتا ۔ وہ کم سے کم باتیں کر کے اپنی ذہنی قوتیں بحال رکھنا چاہتا۔ کیونکہ سرِ شام اس کی دکان پر قصبے کے پڑھے لکھے جوانوں کا ایک مجمع لگتا ۔ نذیر نے ایک شیشے لگے ریک میں چند رسالے ۔ ناول اور غزلوں کے دیوان سجا رکھے تھے ۔ نوجوان رسالے پڑھنے ناول لینے یا واپس کرنے آتے اور پڑھی ہوئی چیزوں پر بحث ہوتی ۔ نذیر اس ادبی بحث میں خوب چہکتا ۔ سارے دن کی بچائی ہوئی قوتیں تنقید اور تبصرے میں مسرفانہ طور پر صرف ہو جاتیں تو نذیر دکان بڑھا دیتا ۔

رات کو وہ کچھ نہ کچھ لکھتا بھی ۔ غزل سے اسے خاص رغبت تھی ۔ اور جگر اس کا محبوب شاعر تھا ۔ جگر کی تقلید میں اس نے چند شعر لکھے تھے لیکن ابھی ان میں خام پن تھا ۔ اس لئے اس نے اپنی سنہری جلد والی بیاض لوگوں کی نظروں سے یوں بچا کر رکھی تھی جیسے وہ ناتراشیدہ ہیرے جواہرات کا ایک خزانہ ہو ۔

نذیر کی دکان پر حسن و عشق کی باتیں بھی ہوتیں لیکن نذیر اس بات چیت کو ایک خاص لَے سے آگے نہ بڑھنے دیتا ۔ اس دھیمی سی لَے میں تیزی اور تندی نہ ہوتی بڑا میٹھا سا کیف ہوتا جو طوفان نہیں بنا کرتا اور جس میں نسیمِ صبح کی ہلکی سی خنکی اور مدہم سی سرشاری ہوتی ہے ۔ وہ کہا کرتا تھا "عورت بے شک محبوب ہے مگر وہ ماں اور بہن کا مقدس روپ بھی ہے ۔ اس لئے ایسا بول نہ بولو کہ عورت کی تذلیل ہو" نذیر کی محفل میں بیٹھنے والے اس قدغن سے خوب واقف تھے ۔

نذیر اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں بہت خوش تھا!

یہ زندگی جھیل کے پانی کی طرح طوفانوں سے ناآشنا تھی ۔ اگر کبھی کبھار کوئی ننھا سا کنکر گر بھی جاتا تو چند دائرے بنتے ۔ چند لہریں اٹھتیں اور کناروں سے ٹکرا کر پھر سکون سے ہم آغوش ہو جاتیں ۔ نذیر کی اس دنیا میں صرف اس کی بوڑھی ماں اور

لیکن ننھی سی بہن شامل تھیں ۔ نذیر کی ماں اس پر شادی کے لئے زور ڈالتی تھیں لیکن نذیر انہیں بڑے فنکارانہ انداز میں ٹرخائے جا رہا تھا ۔ اپنی برادری میں کوئی ایسی لڑکی نہ تھی جو اس کی نگاہوں میں جچ سکتی ہو اور قصبہ اتنا چھوٹا سا اور قدامت پسند تھا کہ انتخاب کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ وہ کہتا "اماں تھوڑی سی آزادی کا موقع اور دیجئے ۔ آخر میں ساری عمر کنوارہ تو نہیں رہ سکتا ۔" اور وہ دوستوں سے کہتا "یار و نذیر کون سا عرش سے اُترا ہوا فرشتہ ہے ۔ کہ زمین کی آلائشوں سے پاک رہ سکے گا ۔ ابھی کچھ دن اور بلندیوں پر کاٹ لینے دو کسی دن الف لیلوی شہزادی دریچے سے اشارہ کرے گی اور یہ شہزادہ اس کے قدموں پر سر رکھ دے گا ۔"

اس دن بے پناہ گرمی اور حبس تھا ۔ پیاس گھڑی گھڑی لگ رہی تھی اور پانی سوکھے ایندھن پر تیل کا کام کرتا تھا ۔ بس ایک اڈے پر کھڑی ہوئی تو نذیر نے اُتر کر دودھ سوڈا پیا ۔ ماتھے کا پسینہ پونچھا اور بس سے تھوڑی دُور ہٹ کر کھڑا ہو گیا ۔ کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت نے کہا "ایک دودھ سوڈا مجھے بھی لا دیجئے ۔"

"دودھ سوڈا !" نذیر نے گھوم کر پوچھا "آپ مجھ سے کہہ رہی تھیں ، مجھ سے ....."
کسی غیر عورت سے بات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا ۔ اس لئے نذیر کی زبان میں ژولیدگی سی آ گئی ۔

"جی ہاں ، آپ سے ......!" اس برقعہ پوش عورت نے کہا "امید ہے کہ آپ نے بُرا نہ مانا ہو گا ۔"

"نہیں ..... نہیں .....!" نذیر نے کہا اور لپک کر دکان پر پہنچا ۔ دودھ سوڈے کی ایک بوتل کھلوائی اور گلاس بھر کر کھڑکی کے پاس لے آیا ۔ عورت نے گلاس ہاتھ

میں لے کر کہا "شکریہ!" نذیر کھڑکی کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس عورت نے کہا "یہ گلاس!" نذیر نے گلاس لیا اور اس کے ساتھ عورت نے اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ بھی تھما دیا۔ نذیر نے کچھ دیر بعد نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا "معاف کیجیے! اس کی ریزگاری نہ مل سکی"!

"پھر تو میں آپ کی پانچ آنے کی مقروض ہوں"!

"جی..... نہیں..... شرافت کا تقاضا یہی تھا کہ....."

"آپ کہاں جا رہے ہیں"؟ عورت نے پوچھا۔

"لاہور" نذیر نے حیران ہو کر کہا۔

"مجھے پوچھنے کا حق تو نہیں..... امید ہے برا نہیں مانیں گے کس کام سے"؟

"منیاری کا سامان خریدنے کے لئے"!

"کس دکان سے"؟ نذیر نے پھر حیران ہو کر عورت کے چہرے کی طرف دیکھا جو نقاب کی اوٹ میں تھا۔

عورت نے کہا "مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا"؟

"نہیں..... نہیں۔ ڈائمنڈ جنرل سٹور"!

"ڈائمنڈ جنرل سٹور!" عورت نے دہرا کر کہا اور بس نے ہارن دے دیا۔ نذیر چند لمحے مبہوت کھڑا رہا۔ وہ کود کر چلتی بس پر سوار ہوا اور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس کی سیٹ عورت کی سیٹ سے کافی فاصلے پر تھی۔

بس دوڑتی رہی اور نذیر کی توجہ بار بار برقعہ پوش عورت کی طرف لپکتی رہی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک نامحرم عورت نے اس بے تکلفی کے ساتھ اس سے باتیں کی تھیں۔ اس کے اپنے ماحول کی کوئی عورت ہوتی تو پیاس سے جان دے دیتی لیکن کسی غیر مرد سے مخاطب نہ ہوتی۔ لیکن یہ عورت عجیب تھی اور نذیر ورطۂ حیرت

میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس نے دریچے میں بیٹھی ہوئی شہزادی کی پہلی جھلک پا لی تھی اور اس جھلک میں بلاوے کا اشارہ بھی تھا۔ نذیر نے سر کے ایک جھٹکے سے اس خیال کو دور پھینک دیا۔" میں بھی کتنا بیوقوف ہوں۔ سفر میں ایسے واقعات عام ہیں۔ ایک عورت نے پانی کا ایک گلاس مانگ لیا تو کونسا طوفان آگیا۔" لیکن باوجود کوشش کے وہ خیال پھر آموجود ہوا۔ سارا راستہ اسی ادھیڑبن میں گذر گیا۔ وقت پر لنگر اسٹا اور لیس لاہور کی بھیڑ میں داخل ہو گئی اور پھر اڈہ آگیا۔

نذیر بس سے اتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ الف لیلوی شہزادی اتری اور ایک شان بے نیازی کے ساتھ اس کے پاس سے گذر گئی۔ اس کا الف لیلوی خواب چکنا چور ہو گیا اور اسے اپنے آپ پر ہنسی آگئی۔" واہ میرے الف لیلوی ہیرو!" اور اس ہنسی کے بعد اسے شرم بھی محسوس ہوئی جیسے اس نے اپنے ہاتھوں اپنے انا کی تذلیل کر لی ہو۔

ڈائمنڈ جنرل سٹور کے ہیڈ سیلزمین نے بڑی خوش اخلاقی سے کہا "مسٹر نذیر! آپ جو کچھ خریدنا چاہتے ہیں، اس کی ایک فہرست بنا کر دیجئے گا۔" ہیڈ سیلزمین کی یہ خوش اخلاقی خلاف معمول تھی۔ اس سے پہلے بھی نذیر ڈائمنڈ جنرل اسٹورز پر خریداری کے لئے آیا کرتا تھا لیکن ہیڈ سیلزمین کبھی اتنی خوش اخلاقی سے پیش نہ آیا تھا۔ نذیر نے حیران ہو کر فہرست بنائی اور اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ سیلزمین نے کہا " آپ ذرا کمرے میں تشریف رکھیں۔ آپ کا سامان بندھوا دیا جائے گا۔" نذیر اور حیران ہوا۔ آج تک اسے کھڑے کھڑے ٹرخا دیا جاتا تھا۔ آج یہ مہربانی کیوں؟ اس نے ساتھ کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ بے دھیانی

میں اس صوفے کی طرف بڑھا جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ چند قدم چل کر اسے غلطی کا احساس ہوا۔ وہ ٹھٹکا اور اس کے قدم پکے فرش کے ساتھ چپک گئے۔

ایک نسائی آواز نے کہا "بیٹھئے! اگر ضرورت ہو تو میں یہ صوفہ خالی کر دوں۔"

"نہیں...... نہیں......!" اس نے غیر ارادی طور پر کہا۔

اور پھر اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی جیسے اسے کوئی ایک بھولا بھٹکا نغمہ یاد آگیا ہو وہ ایک کرسی کی طرف بڑھا اور گدیلے میں دھنس گیا۔ پنکھے کی ہوا سے اس کا پسینہ سوکھ رہا تھا اور بدن پر ٹھنڈک سی رینگ رہی تھی اس کی آنکھیں مندھ گئیں۔

"پانی پیجئے گا؟"

وہ چونک گیا "نہیں...... معاف کیجئے گا...... مجھے پیاس نہیں!"

"نہیں...... کیوں؟ مجھے اس احسان کا بدلہ چکانے کا موقع نہیں دیں گے جو بس میں آپ نے ایک اکیلی عورت کے ساتھ کیا تھا۔"

"تو وہ عورت آپ ہیں؟" نذیر نے گلاس پکڑتے ہوئے کہا "آپ ڈائمنڈ اسٹور میں کیسے پہنچیں؟"

اب عورت کی بجائے سیلزمین نے جواب دیا جو ہاتھ میں رنگین شربت کا ایک جگ لئے کھڑا تھا۔

"مسٹر نذیر! یہ ڈائمنڈ کی مالکہ ہیں۔" سیلزمین نے اس کے کانپتے ہاتھ میں لبالب بھرا ہوا گلاس تھما دیا۔ گلاس کا شربت چھلکا اور فرش پر گر گیا۔ اس نے بدحواس ہو کر گلاس منہ سے لگا لیا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ سیلزمین نے دوسرا گلاس بھرا۔ پھر تیسرا اور نذیر کا گلا پھر بھی خشک رہا۔ اس کی پیاس تیز سے تیز تر ہوتی گئی حتیٰ کہ جگ خالی ہو گیا۔

وہ سیلزمین نے پوچھا" اور؟ اور نذیر نے بے خیالی میں سر ہلا دیا اور یہ محض اتفاق تھا کہ سر کی اس حرکت کا مطلب "نہیں" تھا۔

کچھ دیر بعد نذیر کو جرأت ہوئی کہ ڈرتے ڈرتے اس صوفے کی طرف دیکھ سکے جہاں اس کی میزبان بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ صوفہ خالی تھا۔ نذیر نے اطمینان کی خاطر سارے کمرے کا جائزہ لیا کمرہ خالی تھا۔ وہ اٹھا اور ڈائمنڈ اسٹور کے کونٹر پر آیا۔ ہیڈ سیلزمین نے کہا "مسٹر نذیر! آپ تشریف رکھیں۔ آپ کا سامان وہیں پہنچ جائے گا" نذیر پھر کمرے میں واپس چلا آیا۔ کمرے کی فضا میں سکون تھا اور ٹھنڈک تھی۔ پنکھا چل رہا تھا اور نذیر کے حواس کا ابلتا ہوا چشمہ ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ خنکی کا یہ احساس اس کے جسم سے ہوتا ہوا اس کی روح تک پہنچا اور وہ الف لیلوی داستانوں کے گلزاروں میں کھو گیا۔ دریچے میں بیٹھی شہزادی نے مبہم سا اشارہ ضرور کیا تھا۔ ابھی رخ سے نقاب اور اسرار کے پردے نہیں اٹھے تھے۔ یہ چھلک شراب کا ابلتا ہوا جام بھی نہ بنی تھی کہ شہزادہ بیہوش ہو کر بیچ ہی راستے گر پڑا مگر اس نے الف لیلوی داستانوں کے جادو کی ایک جھلک ضرور دیکھ لی تھی۔

نذیر کا سامان بندھ کر آگیا۔ اس نے بل ادا کیا۔ تو سیلزمین نے ایک رقعہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا "اسے یہیں پڑھ لیجئے۔ جواب اس کی پشت پر لکھ دیجئے گا" نذیر نے کانپتے ہاتھوں سے رقعے کی تہیں کھولیں۔ اندر صرف دو سطریں تھیں "مسٹر نذیر میں نے آپ کے چہرے سے لیاقت اور خوش اخلاقی کے نقوش پڑھ لئے ہیں۔ کیا آپ ڈائمنڈ جنرل اسٹور کے مینجر کی حیثیت سے کام کرنا پسند کریں گے۔ زینت"

رقعہ نذیر کے ہاتھ سے گر پڑا۔ سیلزمین نے اٹھا کر پھر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ نذیر نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا "یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں یہ افسانہ ہے یا حقیقت؟"

اس نے حیرت زدہ ابوالحسن کے انداز میں پوچھا۔

"سولہ آنے حقیقت" سیلز مین نے کاروباری زبان میں جواب دیا۔

"بڑا کھرا سودا ہے۔ انکار نہ کریں"

نذیر نے لکھا "مجھے انکار نہیں"

اور یہ تین لفظ پھیل کر اس کی زندگی پر حاوی ہو گئے۔ اس نے قصبے کی دکان بڑھا دی۔ ڈائمنڈ جنرل سٹور کے منیجر کی حیثیت سے وہ بہت کامیاب رہا۔ لیکن جب الف لیلوی شہزادی نے نقاب اٹھایا تو وہ غش کھا کر نہ گرا۔ ڈائمنڈ جنرل اسٹور کی مالکہ جوانی کے اس دور سے گذر چکی تھی۔ جس کی ایک جھلک پا کر الف لیلوی شہزادے بیہوش ہو جایا کرتے تھے۔ ابھی جوانی موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے کھنڈروں میں تبدیل نہ ہوئی تھی۔ نقوش اچھے تھے اور میک اپ بڑی فنکارانہ تھی، لباس بڑا تنگ اور چست تھا۔ جسم کی قوسیں اور محرابیں، دائرے اور خطوط بھی نمایاں تھے۔ بالوں میں چمکدار سیاہی بھی موجود تھی۔ لیکن ہیئت مجموعی میں کس چیز کی کمی تھی۔۔ شاید شباب میں گرمی نہیں تھی اور شراب اپنی تندی اور تلخی کھو چکی تھی اور اب تو صرف ارغوانی رنگ کا لہراتا ہوا سراب ہی باقی تھا۔

ڈائمنڈ جنرل سٹور کی مالکہ زینت کے جسم اور دولت کا مالک بن کر نذیر نے کوئی روحانی بالیدگی محسوس نہ کی البتہ اسے کبھی کبھار یہ محسوس ہوتا کہ وہ ایک عورت ہے جس نے دولت کے ہاتھوں اپنے شباب کا خزانہ بیچ دیا ہو۔

زینت ایک جوان بیوہ تھی۔ ڈائمنڈ جنرل سٹور کا مرحوم مالک بڑھاپے کی منزل کو پہنچ چکا تھا جب اس نے زینت کے کنوارپنے کو اپنا شریک زندگی بنایا اور زینت کے والدین نے شریفانہ طور پر اسے دولت کی دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ زینت بیگم کو جب ہوش آیا تو ہر طرف سونے چاندی کے انبار تھے۔ لیکن شباب کے گرم گرم جذبات کو بڑھاپے کی سرد ہوا کا سامنا تھا۔ جوانی کا چراغ قبل از وقت بجھ سا گیا۔

پھر بڑھاپا قبر کی پہنیوں میں لڑھک گیا تو بہار پر خزاں چھا چکی تھی۔ البتہ ایک صدائے بازگشت کا نغمہ زندہ تھا۔ یہ نغمہ جو تسکین ناتمام کا دوسرا رُخ تھا اور نذیر کا شباب اس بجھے ہوئے نغمے کی تال پر رقص کرنے کے لئے مجبور تھا۔

زینت نے گذرے ہوئے شباب کو آواز دی!

اس نے ہر اس حربے کو استعمال کیا جو عورت کر سکتی ہے لیکن جس چراغ کا تیل ختم ہو چکا ہو اس کی زندگی کا نقطۂ عروج آخری ٹمٹماہٹ سے زیادہ کیا ہو سکتا تھا۔

نذیر اب ڈائمنڈ جنرل اسٹور کا مالک تھا۔ رہنے کے لئے بہترین بنگلہ تھا۔ صوفے اور قالین تھے۔ ریشم اور سونا تھا۔ اعلیٰ سوسائٹی میں بار بھی تھا۔ پھر بھی نذیر خوش نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بیگم زینت کے ٹھٹھرے ہوئے جسم سے زیادہ کاروبار میں دلچسپی لینا شروع کر دی اس نے ڈائمنڈ ہوزری اور ڈائمنڈ وولن ٹیکسٹائل ملز کے قیام سے کاروبار کو اتنا وسیع کر لیا کہ اسے زینت بیگم سے بہلنے یا اس میں دلچسپی لینے کی فرصت ہی نہ رہی۔

زینت نے اس شریفانہ فرار کو محسوس کیا تو اس نے گذرے ہوئے شباب کی تجدید کے ساتھ ساتھ نسائیت کی ہر اس ادا سے کام لیا جو مرد کو اپنے قبضے میں لا سکتی ہے۔ نسائیت نے ماں کا روپ دھارا۔ بڑی بہن کا کردار ادا کیا۔ نذیر کی دیکھ بھال میں ایک ایک لمحہ صرف کرنا شروع کر دیا۔ شفقت اور محبت کے اس سیلاب میں نذیر نے اپنی انفرادیت کو ڈوبتے ہوئے محسوس کیا تو وہ ایک دن تلملا کر رہ گیا۔ اس نے خشونت سے کہا "بیگم! میں نے اپنا جسم تمہارے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اپنی روح کا سودا نہیں کیا تھا" بیگم نذیر دم بخود رہ گئی۔ آسمان سے بجلی گری اور اس کا جسم راکھ کا

غبار بنا اور محبوب کی کج ادائی پر چاروں کھونٹ بکھر گیا۔ میک اپ کے باوجود جھریاں گری ہوئیں اور سرخی کے باوجود ہونٹوں پر زردی کھنڈ گئی۔ آنکھوں کی چمک جاتی رہی اور ٹوٹا ہوا دل آنسوؤں کے ساتھ بہہ نکلا۔ نذیر نے اپنے ستم کو محسوس کیا۔ تو بڑھ کر بیگم کو تھام لیا۔ اس نے اپنے رومال سے بیگم کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا "زینت! مجھے معاف کر دو"۔ زینت نے بظاہر اسے معاف کر دیا لیکن اس کی روح نشتر کے اس کچوکے کو کئی دنوں تک محسوس کرتی رہی اور زخمی ہو ہو کر کراہتی رہی۔ کئی ماہ تک بجھی ہوئی راکھ میں پھر زندگی کی چنگاری نہ چمکی اور نذیر نے اپنی مصروفیات کو اور زیادہ بڑھا لیا۔ فرار اور گریز کی پناہ گاہیں اور حصار اور زیادہ مضبوط کر لئے۔ کبھی کبھار اسے اپنے چھوٹے سے قصبے کی معصوم سی زندگی کی یاد آتی تو اس کے ہونٹوں سے بے اختیار آہ نکل جاتی۔ سنہری جلد والی بیاض ابھی تک اس کی دراز میں موجود تھی اور اس کے کچے پکے شعر بھی یاد تھے اور وہ سوچتا میں نے الف لیلوی شہزادی کے ایک بہروپ پر کتنی بڑی قربانی دی شعریت اور روح کی نغمہ سرائی کا بلیدان! اب میرے پاس سوائے راکھ کے باقی کیا رہ گیا ہے"۔ وہ دل سینے کا درد چھپا کے پھر فرار اور گریز کے قلعے میں پناہ لے لیتا۔

اور کروڑوں لمحوں کے گذرتے ہوئے ہجوم میں سے ایک لمحے نے رُک کر اسے دیکھا۔ اس لمحے میں طلسمات کا حُسن تھا اور اس حُسن میں قوس قزح کے سات رنگ تھے۔ ریشمی دھاگوں کے عنکبوتی جال تھے۔ اس لمحے نے یہ جال اس کے گرد تنے۔ یہ جال جو ایک جھٹکے سے ٹوٹ سکتے تھے لیکن ان کے ساتھ روح کی شعریت کا خون بھی ہو جاتا۔

اس لمحے نے دو آنکھوں کا روپ دھارا۔ ان آنکھوں میں سمندروں کی گمبھیرتا تھی۔ پاتال کی انتہاہ گہرائیاں اور پہاڑوں کی خاموش عظمت تھی۔ اور بھنوروں کا رقص تھا۔

کوئل کی کوک اور بلبل کی چہکار تھی - ان آنکھوں کے اسرار میں حیرت بھی - اور حیرت میں وہ شعر بھی تھے جن میں جگر کی سُرخی اور کچی آشاؤں کی خوشبو تھی - ان ارمانوں کا میٹھا درد بھی تھا جو حسرت بن چکے تھے ۔

بیگم زینت نے کہا " یہ رخسانہ ہے - میری رشتہ دار ہے - اسے کچھ دنوں کے لئے بلا لیا ہے ۔"

"بہت اچھا کیا تم نے - تمہارا دل بہلا رہے گا" نذیر نے مسکرا کر جواب دیا لیکن کروڑوں لمحوں کے ہجوم میں سے یہ لمحہ ایک ستارے کی طرح ٹوٹا اور اس کی روح میں روشنی ـــ بن کر سما گیا ۔

رخسانہ بڑی خاموش لڑکی تھی - اس میں چلبلا پن تھا نہ کنوارپنے کی شوخی ۔ اس کا شباب دوپہر کا سورج تھا نہ چودھویں کا کھلا ہوا چاند نجانے کیوں؟ نذیر نے محسوس کیا کہ وہ اس کے لکھے ہوئے شعر کا ایک رخ ہے جس میں خام پن ہے پکے ہوئے پھل کا وہ گداز نہیں جو ٹوٹ کر جھولی میں آ گرتا ہے - لیکن رخسانہ اس کے خوابوں کی تعبیر کیوں بن رہی تھی؟ شاید الف لیلوی شہزادی نے آج پہلی بار دریچے سے جھانکا تھا - صدیوں کے بعد اس نے اپنی خوابوں کی ملکہ کو دیکھا تھا - اور یہ بہروپ نہیں تھا - اصلی روپ تھا جو بجلی کا کوندا بن کر نہ لپکا - رخسانہ ایک ڈری سہمی کرن کی طرح آئی اور اس کے شبستانِ حرم میں داخل ہو گئی - اس نے جس عورت کا مبہم سا ہیولا دیکھا تھا وہ رخسانہ کے روپ میں تخلیق کا ہر مرحلہ طے کر گیا تھا ۔ رخسانہ کی آنکھیں اس کے شاعرانہ تخیّل سے بھی زیادہ حسین تھیں - ان میں بولتا ہوا جادو تھا - رخسانہ کا قد بوٹا سا تھا - اس کی پیشانی میں آسماں کی سی بے کراں وسعتیں تھیں ۔ اور اس کے بالوں میں شبِ دیجور کی سیاہی تھی اور اس سیاہی میں ان دیکھے پھولوں کی خوشبو - وہ خوشبو جو معطر سانس کی طرح شامِ زندگی میں کسی نامعلوم دریچے سے

سے گھس آتی ہے۔

جب تک رخسانہ اس کے گھر میں رہی، وہ اس کی ہستی سے شعوری بے اعتنائی برتتا رہا لیکن جب رخسانہ جانے لگی تو اس کے لاشعور نے شعور سے بغاوت کر لی۔ ضبط کا سر بند ٹوٹ گیا۔ اس نے رخسانہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اتنی بڑی جرأت پر اس کے حواس تنکوں کی طرح نہ بکھرے۔ اگرچہ رخسانہ ڈالی سے ٹوٹے ہوئے خشک پتے کی طرح تھرتھرائی، کانپی اور لرزی۔ یہ لرزش اس کے دل میں اتر گئی۔ اس نے کہا "رخسانہ! میں مدتوں سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" رخسانہ کی لرزش حیرت کے گرداب میں ڈوب گئی۔ اس نے طوفان میں گھری ہوئی کشتی کی طرح ہچکولے کھائے تو نذیر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور اس کی نیم آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "رخسانہ ہم زندگی کے کس موڑ پر ایک دوسرے سے ملے ہیں؟ زندگی کا یہ موڑ!" رخسانہ نے جھکی ہوئی آنکھیں اٹھائیں۔ پلکوں کے سائے اٹھالئے۔ وہ لمحہ جو ایک ستارے کی طرح ٹوٹا تھا چنگاری کی طرح چمکا۔ اور نذیر نے اسے اپنے دل میں یوں رچا لیا کہ یہ لمحہ زندہ تابندہ ہو کر زندگی کے اندھیرے راستوں پر شمع راہ بن گیا۔

رخسانہ چلی گئی!

نذیر نے فرار اور گریز کے حصار میں پناہ لے لی۔

اس نے اپنے مشاغل کو جنون آمیز حد تک اپنی زندگی میں حاوی کر لیا۔ ایک ایک لمحہ سونے چاندی کے انبار میں بدل گیا۔ اور نذیر اس مجنونانہ دوڑ میں اپنی ذات سے بھی بے نیاز ہو گیا۔ اس کے بال الجھ گئے۔ شیو بڑھی رہنے لگی۔ کپڑے میلے اور شکن دار ہو گئے۔ آنکھیں بے خوابی کی وجہ سے سرخ ہو کر اپنی چمک کھو گئیں۔ بیگم نذیر نے اس حالت کو دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گئیں۔ انہوں نے پھر دامن محبت کی ہوا دی۔ نذیر نے اپنے گرد خواہرانہ اور مادرانہ فردوس کے سایوں کو پھیلتا ہوا محسوس کیا تو گھبرا کر

آنکھیں کھول دیں۔

بیگم نذیر نے کہا "تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھ رہے نذیر۔"

"تم خواہ مخواہ فکر کرتی ہو میں اچھا بھلا ہوں۔"

بیگم نذیر نے پھر اس کی ہستی کو اپنے تصرف میں لینا چاہا تو نذیر نے سٹپٹا کر کینچلی اُتار ڈالی۔ وہ پھر پرانی ڈگر کی طرف لوٹ گیا لیکن بیگم نذیر مطمئن نہ ہوئیں اور ایک دن وہ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس اٹھا کر اپنے کسی دور کے رشتہ دار کے ہاں شادی میں شرکت کے لئے چلی گئیں۔ چند دنوں کے بعد جب وہ واپس آئیں تو بہت مطمئن تھیں اور تازہ لگے چہرے پر بڑی پر اسرار مسکراہٹ تھی۔

نذیر نے جب کئی برسوں کی خاموشی کے بعد رخسانہ کے تصور میں ایک غزل تخلیق کی تو بیگم نذیر نے بھی تخلیق کے میدان میں بڑھ کر قدم مارا اور نذیر ایک صحت مند بچے کا باپ بن گیا۔ نذیر کی غزل میں ابھی ناپختگی کے کئی پہلو تھے لیکن بیگم کی تخلیق ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ نذیر نے سنہری جلد والی بیاض پھر صندوق میں دفن کر دی۔

ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ اس میں کوئی رخسانہ نہیں تھی۔ اس دورِ زندگی میں بیگم زینت کی ہستی بھی ایک نقطۂ موہوم بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن بیگم نذیر بھی تخلیق کے اس مرحلے پر نذیر سے بے نیاز ہو کر رہ گئیں۔ بچہ ماں اور باپ دونوں کی توجہ اور محبت کا مرکز بن گیا۔ پھر اس بچے کے بعد دوسرا بچہ پیدا ہوا تو نذیر نے پہلی بار اپنی کنپٹیوں پر دو سفید بال دیکھے۔ اور وہ مسکرا دیا "آخر بڑھاپا آ ہی پہنچا لیکن الف لیلوی شہزادے تو موت کے دروازے تک پہنچ کر بھی جوان رہتے ہیں۔ رخسانہ!۔۔۔ ہوں۔ رخسانہ کو بڑھاپے کے دروازے پر دستک دینے کی کیا ضرورت ہے۔" اس کے ہونٹوں سے ایک خشک پژمردہ سی آہ نکل گئی۔" نہ جانے رخسانہ کہاں

ہے" اس نے سوچا۔ بیگم نذیر نے دوسری بار رخسانہ کو دعوت دینے کی جرأت نہ کی تھی "عورت کی چھٹی حس نے میری بے حسی کے ساتھ رخسانہ کے غیر محسوس تعلق کو نہ جانے کیسے محسوس کر لیا تھا!"

رخسانہ زندگی کے ایک موڑ پر جدا ہوئی تو پھر ان کا کسی پگڈنڈی پر آمنا سامنا نہ ہو سکا۔

دوسرے بچے کی پیدائش پر بیگم نذیر محض ماں بن کر رہ گئی۔ وہ عورت مر گئی جو نذیر کو نسائیت اور شباب کے فریب میں مبتلا رکھنا چاہتی تھی۔ چہرے سے غازے کی تہیں اتریں۔ آنکھوں سے سُرمہ جاتا رہا۔ تنگ پھنسی ہوئی قمیضوں کے گھیرے پھیل کر غبارے بن گئے۔ جسم کا گوشت لٹک آیا۔ زمانے کے بیدرد ہاتھ نے جو ٹیڑھے ترچھے نقوش کاڑھے تھے اب واضح ہو کر رہ گئے۔ نذیر نے پہلی بار شعوری نظر سے بیگم کو اس روپ میں دیکھا تو اس نے سوچا۔ "میری جوانی نے اس عورت سے کیسا فریب کھایا" اور وہ اداس ہو گیا لیکن جب اُسے آئینے میں کنپٹیوں کے سفید بال نظر نہ آئے تو اس نے پھر زندگی سے سمجھوتہ کر لیا۔

بیگم نذیر حنوط شدہ لاش کی طرح جب دن کی روشنی اور ہوا میں آئیں تو راکھ بن کر رہ گئیں۔ مشتِ خاک پر زمانے کی تیز و تند آندھیوں نے یورش کی جیسے وہ اس ارادے کی شکست کا انتظار کر رہی ہوں جو جوانی کے سرودِ رفتہ کی بازیابی کے لیے کوشاں تھا اور اب بڑھاپے نے ساز کا ہر تار توڑ دیا ہو اور ایک دن بیگم نذیر چراغِ سحری کی طرح یکدم بجھ کر رہ گئیں۔ دونوں بچے باغیچے میں کھیل رہے تھے۔ نذیر پلنگ کے پاس گم سم بیٹھا تھا۔ اور اس نے بجھتے ہوئے دئیے کی آخری پھڑپھڑاہٹ کو سنا اور محسوس کیا۔ یہ احساس نیا ضرور تھا لیکن اس میں کوئی چونکا دینے والی کیفیت نہ تھی جیسے وہ اس چراغ کے بجھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے دل پر غم کا

پہاڑ نہ گرا - چار کھونٹ سے اندھیرا بھی نہ لپکا - نہ دنیا جہان کی روشنیاں بجھیں - زندگی کا دیا بجھ گیا جھٹپٹے کا ایک سماں پیدا ہوا - البتہ زندگی میں ایک خلا کا اضافہ ہو گیا - بیگم نذیر آخر عورت تھیں اور ماں - گھر میں خاک اُڑنے لگی - دونوں بچے ماں کی محبت سے محروم ہوئے تو ادھ کھلی کلیوں کی طرح مرجھا کر رہ گئے - نذیر کی ماں فوت ہو چکی تھی اور چھوٹی بہن کی شادی ہو چکی تھی -

خلا پھیلا تو ویرانی اور وحشت کا سماں نظر آنے لگا - نذیر کے دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ نئی شادی کر لے - نذیر نے انکار کر دیا - زندگی کے اس موڑ پر اب کسی رفیقانہ کا ملنا محال تھا - اس نے اشتہار دے کر ایک اینگلو انڈین عورت کو بچوں کے لئے گورنس رکھ لیا - یہ عورت جوان تھی اور اس کی جوانی میں آگ تھی - اسے اپنے خوبصورت جسم کی نمائش کا شوق بھی تھا - ساقی بلوریں پیمانہ سرور تھی - ننگے سڈول بازوؤں میں وہ فردوس بھی نہیں تھا جو ماں کی آغوش سے چشمۂ نور بن کر پھوٹتا ہے - گورنس کو بچوں سے زیادہ نذیر کی ذات میں دلچسپی محسوس ہونے لگی - اس نے مسکراہٹوں، کاجل لاکھی، اور زلفوں کا آتشیں جال پھیلایا - تو نذیر کی شرافت خوف کھا گئی - وہ نہ جانے اس دلدل سے کیوں بچ نکلنا چاہتا تھا، اسے خود بھی حیرت تھی اور اس نے اس گورنس کو جواب دے دیا - دوسری گورنس بوڑھی تھی اور خزاں رسیدہ پتے کی طرح اکڑی مڑی اور خشک روح تھی - اس کے ہونٹ بھنچے رہتے اور آنکھیں محبت کی نمی سے محروم تھیں - نذیر نے محسوس کیا عورت کے اس سائے میں دونوں بچوں کو کملاتا ہوا محسوس کیا تو اس نے اس گورنس سے بھی پیچھا چھڑا لیا - اس نے گھر کی پرانی خادمہ کی مدد سے خود بچوں کی نگہداشت شروع کر دی - وہ خود انہیں اپنے سامنے نہلاتا - دھلاتا - کپڑے پہناتا اور سلاتا - ان کے تہذیب و اخلاق کی غور و پرداخت کرتا - لیکن یہ فرض بہت گراں ثابت ہوا - اسے اپنا کاروبار اپنی گرفت سے نکلتا ہوا محسوس ہوا -

آخر اسے اپنے دوستوں کی رائے پر عمل کرنا پڑا۔

"ہمارے معاشرے میں وہی عورت ماں کے فرائض ادا کرسکتی ہے جو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو" اس نے سوچا اور اشتہار دے دیا "ایک رنڈوے کو جو دو بچوں کا باپ ہے اور ایک کامیاب تاجر ہے۔ اپنے لئے رشتہ درکار ہے۔ بیوہ رشتے کو ترجیح دی جائے گی۔ ن معرفت ڈائمنڈ جنرل اسٹورز۔۔۔"

خطوط کی بھرمار شروع ہو گئی۔ اس کی میز پر نیلے پیلے سُرخ اور معطّر لفافوں کے انبار لگ گئے۔ اکثر خطوط خواہشمند عورتوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھے تھے۔ اسے عجیب عجیب القاب سے نوازا گیا تھا۔ کسی میں اپنی تنہائی کا رونا تھا اور کسی میں سہارے کی تلاش کا اظہار تھا۔ کسی میں نادیدہ محبت کی بڑے بھونڈے الفاظ میں پیش کش کی گئی تھی۔ اکثر خطوط کنواری عورتوں کی طرف سے تھے۔ ان خطوط میں نذیر کے بچوں کی نگہداشت کا بالکل ذکر نہیں تھا اور نذیر نے محسوس کیا کہ ان خطوط کو اس کی کشش نہیں بلکہ ڈائمنڈ جنرل اسٹورز۔ ڈائمنڈ ہوزری اور ڈائمنڈ سلک وولن ٹیکسٹائل ملز کی سنہری دولت کے انبار نے اپنی طرف کھینچا تھا۔ بعض خطوط میں فوٹو بھی تھے عجیب عجیب پوز کے فوٹو تھے۔ ان میں کچھ صورتیں دلنشین بھی تھیں اور نذیر کو مجبور کر رہی تھیں کہ اپنی عمرِ رفتہ کو ایک بار تو آواز دے کر دیکھ لے۔ یہ زہد شکن صورتیں جوانی کی آگ کو پھر سے بھڑکانا چاہتی تھیں اور نذیر نے کبھی اس آگ میں ہاتھ نہ ڈالا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے رہے۔ اور جذبات کی شدت جسم کو پگھلا کر پیشانی پر پسینے کے قطرے بن بن جاتی رہی۔

اس نے ایک ایک خط کو پڑھا۔ پھر ایک سادہ لفافے کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ اس سے عطر کی بھینی بھینی خوشبو یا سینٹ کے بھبکے نہ آئے۔ اس کے کونوں پر پھول بوٹے بھی نہیں تھے۔ اندر کا کاغذ کھردرا تھا۔ اور نذیر نے مسکرا کر سوچا۔ یہ

محترمہ بڑی الل کھری معلوم ہوتی ہے۔ اس خط سے الھڑ سادگی کی بُو آتی ہے۔" لیکن جب نذیر نے کھول کر پڑھا تو یہ کسی مرد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

"محترمی! تسلیم

آپ نے پتے میں محض "ر" کا حرف لکھا ہے۔ لیکن میں سمجھ چکا ہوں کہ آپ کون ہیں۔ آپ مجھے نہیں جانتے کیونکہ آپ کی مرحوم بیوی کی زندگی میں مجھے آپ کے ہاں بار نہیں تھا۔ البتہ ممکن ہے آپ رخسانہ کو جانتے ہوں۔"

رخسانہ!

خط اس کے ہاتھ سے پھڑپھڑا کر گرا اور زندگی کی پر پیچ راہیں اور پگڈنڈیاں شاہراہیں اور خم ایک سنگم پر ایک دوسرے سے گتھ متھ ہو گئے۔ زندگی کا تانا بانا الجھ گیا۔ اس نے تلملا کر کہا "رخسانہ! تو زندگی کے کس موڑ پر ملی؟"

"رخسانہ آپ کی مرحوم اہلیہ کی دور کی رشتہ دار تھی۔ میں بھی رشتے میں رخسانہ کا بھائی ہوں اور میرے سوا اس وقت رخسانہ کا کوئی نہیں۔ رخسانہ کو مرحومہ نے ازراہِ غریب نوازی خود اپنے ہاتھ سے دلہن بنایا اور بیاہ دیا۔ مجھے خبر تک نہ ہوئی لیکن میں حیران ہوں کہ مرحومہ نے اتنی جلدی کیوں کی؟ اب وہ فردوس مقام ہو چکی ہیں۔ وہ یہ راز بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گئی ہیں۔ کون جانے کیا بات تھی؟" اور پھر نذیر نے چونک کر خط میز پر گرا دیا۔ اس کے پانچوں ظاہری حواس سُن ہو گئے۔ نہ روشنی نہ اندھیرا۔ نہ شفق نہ چاند۔ نہ ستارے۔ نہ جانے کب نذیر کی اس نئی دنیا میں ایک نئی کرن پھوٹی۔ تھوڑی سی روشنی ہوئی اور اس پھوٹتی مٹیالے لطیفے میں اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ اس نے بھڑکتی ہوئی آگ بن کر کہا "زینت! تو نے کیا کیا؟ اتنی بڑی کمینگی۔ اتنی رذالت۔ مجھے تم سے یہ امید تو نہ تھی" اور اس کا جی چاہا کہ گھر کی ہر اس چیز سے اس رذالت کا بدلہ لے جس کا تعلق زینت سے تھا۔ لیکن یکایک

پانچوں ظاہری حواس پھر جاگ اٹھے۔ ضبط نے بڑھ کر انتقام کا ہاتھ روک لیا۔ جذبات جو لاوے کی طرح اُبلے تھے پھر برف کی قاشیں بن گئے۔ اس نے بجھی آنکھوں سے خط کو گھورا اور رشل ہاتھوں میں اٹھا لیا۔

" رخسانہ کا خاوند ہمارے خاندان کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ رخسانہ نے اس کے ساتھ مثالی طور پر نباہ کیا۔ اس نے رخسانہ کے جہیز کی ایک ایک چیز بیچ کر شراب اور جوئے کی نذر کر دی۔ اس کے دو بچے ہوئے۔ جب رخسانہ کے پاس کچھ نہ رہا تو اس نے ایک بوڑھی بیوہ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دئے۔ اور رخسانہ کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھما کر گم ہو گیا.... کاغذ کا ایک پرزہ .... طلاق نامہ..... اور اب رخسانہ اکیلی ہے۔ دو بچوں کی ماں ہے۔ نذیر صاحب میں جانتا ہوں آپ شادی کیوں کر رہے ہیں۔ آپ اپنے بچوں کے لئے ماں تلاش کر رہے ہیں۔ اور رخسانہ بہترین ماں ثابت ہو گی۔ کیونکہ اس کی نسائیت نے ممتا کی لذت چکھی ہوئی ہے۔ کوئی کنواری عورت آپ کے بچوں کو ممتا عطا نہیں کر سکتی۔ اس لئے میرے مشورے پر عمل کیجئے کیونکہ یہ خلوص بھرے دل سے نکلا ہوا ہے۔

مخلص جمیل صادق

خط ختم ہو گیا تو رخسانہ زندہ ہو گئی۔ چھریرے بدن والی رخسانہ جس کی آنکھوں میں نیلگوں آسمان کا سایہ تھا اور جس کے جسم میں بیدِ نازک کی لچک تھی۔ اور نو دمیدہ کلیوں کی چٹک جو اس کی سنہری جلد والی بیاض کا ایک کچا پکا شعر تھی۔ اس کی اپنی تخلیق جو ابھی پروان نہ چڑھی تھی۔ تصور کی ایک اڑان ماہ و سال کے لمبے فاصلے طے کر گئی۔

اور نذیر نے باقی تمام خطوط کو نذرِ آتش کر دیا۔

جمیل صادق کا لفافہ جیب میں ڈال کر وہ راولپنڈی چلا گیا۔ ہوٹل کے گیراج میں

کار ٹھہرا کر وہ پا پیادہ گلیوں کی خاک چھاننے لگا۔ کافی تلاش کے بعد ایک تنگ سی گلی میں جمیل صادق کا مکان آخر اسے مل ہی گیا۔ جمیل صادق ایک منحنی سا انسان تھا۔ آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک تھی۔ گھر کے سامنے گلی میں کھڑے ہو کر اس نے نذیر کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر عینک اتار کر شیشے صاف کرنے لگا۔ "معاف کیجئے!"

"میں نذیر ہوں" منحنی جمیل صادق اُچھل کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "آپ..... آپ، تو گویا آپ نے میری پکار کو سن لیا۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں اور اس نے نذیر کو بازو سے پکڑ کر چائے پانی کے لئے پوچھا۔ لیکن نذیر نے کہا جمیل صاحب! میں رخسانہ سے جلد سے جلد ملنا چاہتا ہوں۔

"اتنی جلدی! پہلے میں رخسانہ کو اس ملاقات کے لئے تیار تو کر لوں۔"

"نہیں...... نہیں...... یہ ملاقات بڑے غیر رسمی ماحول میں ہونی چاہیئے۔ کیا رخسانہ کو اس کا علم ہے؟"

"نہیں تو۔ یہ اشتہار میری نظر سے گذرا تھا۔ میں نے محض انسانی ہمدردی کے طور پر......"

"ٹھیک ہے...... آپ نے بہت اچھا کیا لیکن ابھی رخسانہ کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

جمیل صادق آگے آگے چل پڑا۔ بیشمار گلیوں کی بھول بھلیوں میں سے گزر کر وہ ایک غار نما کوچے میں پہنچے۔ اور یہاں ایک بوسیدہ سے مکان پر جمیل نے دستک دی۔ ایک ننھے سے بچے نے دروازہ کھولا! اور تتلا کر کہا "امی...... مم...... مماجان"۔

جمیل نے ایک قدم بڑھا کر بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ یہ ایک تنگ سا کمرہ تھا۔ اس میں روشنی بھی کم تھی۔ کمرے میں ایک پلنگ تھا۔ دو کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی تھی۔ لیکن کمرہ صاف تھا۔ اور پلنگ پوش بے داغ اور سفید تھا۔ پرانی کرسیوں پر

گرد بھی نہیں تھی۔ جمیل نے کہا " بیٹھئے نذیر صاحب " نذیر کرسی پر بیٹھ گیا تو جمیل کمرے سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد جمیل نے آکر کہا " نذیر صاحب! رخسانہ آپ سے ملنے کے لئے آ رہی ہیں "

" رخسانہ! " نذیر نے تڑپ کر کہا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کمرے کا دوسرا دروازہ کھلا۔ روشنی میں تھوڑا سا اضافہ ہوا۔ دوسرے لمحے نذیر کو محسوس ہوا کہ رخسانہ پلنگ پر بیٹھ چکی ہے۔ اس کا سر جھکا ہوا ہے۔ اور سفید اوڑھنی کا پلو اس کے سر کو کانوں کی لوؤں تک ڈھانپے ہوئے ہے۔ نذیر پہلی نظر میں اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ دوسری نظر پر پھر روشنی ہوئی تو نذیر نے کہا " رخسانہ! مرحومہ زینت کی وصیت تھی کہ میں آپ سے ملوں مجھے آپ کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ یہ بھائی جمیل کی مہربانی اور اتفاقیہ ملاقات کا نتیجہ ہے کہ میں آپ کے ہاں پہنچ سکا "

" جی! " رخسانہ نے کہا اور جھکا ہوا سر تھوڑا سا اٹھا۔ نذیر نے دوسری نظر رخسانہ کے چہرے پر ڈالی تو اس کے ہونٹوں سے ایک آہ نکل گئی۔ نذیر نے محسوس کیا کہ اس کا نیم پختہ شعر پامال ہو چکا ہے۔ اور ادھ کھلی کلی نہ جانے کب پھول بنی تھی اور کب پھول مرجھا چکا تھا "

جمیل صادق نے کہا " رخسانہ بہن! مرحومہ زینت کی وصیت تھی کہ نذیر صاحب آپ سے ملیں۔ میں نے آپ کی زندگی کے سارے واقعات ان کے گوش گزار کر دئے ہیں " اور رخسانہ کا جھکا ہوا سر تھوڑا اور بلند ہوا حتیٰ کہ وہ آنکھیں نذیر کی آنکھوں سے جا ملیں جن سے ایک " لمحہ " شرارے کی طرح پھوٹتا تھا۔ اور آنکھوں میں بجھی ہوئی راکھ تھی۔ غم واندوہ کے سیاہ بادل تھے۔ جن کے پیچھے کسی ستارے کی ٹمٹماہٹ نہیں تھی۔

" وہ لمحہ " مرچکا تھا۔

نذیر کے جذبات شل ہو کر رہ گئے۔ برف کا ایک تودہ پھسلا اور اس کے سینے پر آ پڑا۔ وہ کانپتے قدموں سے اٹھا اور رخسانہ کے مکان سے نکل آیا۔ ہوٹل میں واپس پہنچ کر اس نے کانپتے ہونٹوں سے کہا: "جمیل صاحب آپ کا شکریہ! میرے خط کا انتظار کریں۔ رخسانہ سے میری ملاقات کے مقصد کا ذکر ہرگز نہ کریں۔"

"نہیں..... نہیں۔ آپ مجھ پر اعتماد کیجیے۔" لاہور پہنچ کر نذیر نے جمیل کو لکھا۔

"محترمی تسلیم! یہ خط رخسانہ کو پہنچا دیں۔ آپ اسے پڑھ سکتے ہیں۔"

"محترمہ!"

مرحومہ زینت آپ کے لئے وصیت کر گئی تھیں کہ آپ کو دو سو روپیہ ماہوار ملتا رہے۔ میری ملاقات کا یہی مقصد تھا۔ الحمدللہ اس کو پورا کرنے کے قابل ہو سکا۔ گزشتہ چند ماہ کا بقایا آپ کو بینک کی معرفت بہت جلد مل جائے گا۔" لفافہ بند کر کے نذیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

دو چار دنوں کے بعد نذیر کی کوٹھی کے کشادہ دالان میں جوان اینگلو انڈین گورنس دھوپ میں اس کے بچوں کو کھلا رہی تھی اور اس کے آتشیں گیسو شعلہ بار تھے۔ نذیر کو دیکھ کر اس کے سرخ ہونٹ مسکرائے۔ ایک شعلہ سا لپکا اور نذیر کا چہرہ اس بوسیدہ ورق کی طرح تڑ مڑ گیا جس نے آگ دیکھ لی ہو۔

گاؤں کا شاعر

میرے گاؤں کا نام ڈھولن ہے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس کی زمین چھ چھ سات سات گھماؤں کی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس لئے اس کا ہر آدمی چوہدری ہے۔

میرے گاؤں کی تین چیزیں مشہور ہیں:۔

میں... سب سے پہلے اپنا ہی نام کیوں نہ لوں..... اگرچہ اپنے منہ میاں مٹھو بننا کسی شرع میں جائز نہیں۔ پھر بھی میں گاؤں کی تین مشہور چیزوں میں سے نمبر ایک ضرور ہوں کیونکہ میں نے گل بہار کے پرائمری سکول کے آخری امتحان میں وظیفہ حاصل کیا، دینا پور کے قصبے سے مڈل کا امتحان پاس کیا، رینگ رینگ کر اپنے گاؤں سے بیس میل دور شہر جا پہنچا، دو سال کے بعد میٹرک کے امتحان میں بھی کامیاب ہو گیا۔ ٹائپ سیکھا اور ایک فرم میں، جو بینڈ کا سامان تیار کرتی ہے، ملازم ہو گیا۔ اب میں بیک وقت فرم کا اسٹور کیپر اور سیلز مین ہوں۔ اکثر فرم کے سفری ایجنٹ کی حیثیت سے دورہ بھی کرتا ہوں۔ میں نے بہت سے شہروں کی سیر کر لی ہے۔ گاؤں کو مجھ پہ ناز ہے۔ میں نے اپنا نام بھی ڈی۔ ایم ناز رکھ لیا ہے۔

دوسرے نمبر پہ گاؤں کے شاعر کا نام لوں یا زینی کا؟ میں مدت سے سوچ رہا ہوں۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ فیصلہ آپ کر لیجیے۔ میں تو گاؤں کے شاعر

اور نہ زینی کا نام اکٹھا ہی لوں گا۔ زینی سے پہلے ڈھولن ایک پرسکون گاؤں تھا۔ ایک گدلا سا جوہڑ جس کے پانی میں کوئی لہر نہ تھی۔ زینی ایک کنکر بن کر پانی میں گری، حلقے اور دائرے بنے، پانی میں ہلچل ہوئی، لہریں کناروں کے ساتھ ٹکرائیں، سیکڑوں سورج پانی کے ایک ایک حلقے میں زندہ ہو کر چمکے۔ اتنے شرارے چھوٹے کہ آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ بہاروں کے قافلے آگئے، پرندے چہچہائے، خوشبوؤں کے طوفان بکھرے، رنگ اور آہنگ گلے مل گئے۔

زینی نے ڈھولن کی زمین سے جنم لیا تھا، پر اس کی جوانی آسمانوں سے اتری تھی یا کوئل کی ایک کوک نے جنم لیا تھا۔ بے چین، مضطرب، تڑپتا پھڑکتا جسم، جس میں بجلیوں کی کوند تھی، ساون کی گھٹاؤں کا بے قرار ترنم اور چھما چھم برستی ہوئی بوندوں کا ملہار راگ تھا اور گاؤں کا شاعر تو گویا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ دو ٹوٹے ہوئے تارے جو صدیوں سے ایک دوسرے کی راہ دیکھ رہے تھے نہ جانے کب ملے، پر جب گاؤں نے آنکھیں کھولیں تو یہ معجزہ بھی رونما ہو چکا تھا۔

یہ ذکر بھی ذرا قبل از وقت ہے۔ گاؤں کا شاعر چار بھاؤں میں سب سے چھوٹا تھا! کچھ عجیب بات ہے کہ وحید سب بھائیوں سے چھوٹا ہوتا ہے اور وہ بھائیوں کا لاڈلا بھی ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بھابی اُسے اپنا پہلوٹھی کا بیٹا سمجھتی ہے لیکن سب سے چھوٹی بھابی نہ جانے کیوں اُس سے کھار کھاتی ہے۔ سب سے چھوٹی بھابی، جس کے سہاگ میں ابھی دوشیزگی کی خوشبو ہوتی ہے، ہاتھوں پر ابھی تک حنا کی سرخیاں باقی ہوتی ہیں۔ انگلیوں میں گننے کی پختہ پوروں کا رس ہوتا ہے۔ ابھی برتن مانجھ مانجھ کر اور اُپلے تھاپ تھاپ کر یہ پورے سخت اور کھردرے نہیں ہوتے، ابھی چوڑیوں کی جھنکاریں جوانی کے کچے پکے نغمے ہوتے ہیں۔ چھوٹی بھابیاں اپنے سب سے چھوٹے دیور سے شاید اس لئے جلتی ہیں کہ

اُن کا بَر سب سے چھوٹا کیوں نہیں کہ رات رات بھر اُسے کنوئیں پر نہ رہنا پڑے یا گرم دوپہر کو جب سائے سمٹ کر تنوں سے لپٹ جاتے ہیں، وہ کھیتوں میں کام کرنے کی بجائے اُن کی جوانی کے ٹھنڈے سائے تلے کیوں نہ آ بیٹھے اور پھر رات کی خنکیوں میں جب ہوا رہ رہ کر ٹھنڈے سانسوں کا خنک مرہم تقسیم کرتی ہے وہ کھیتوں میں پانی کیوں لگائے اور کیاریوں میں نالیاں کیوں باندھے۔ یہ کام تو دیور کا ہونا چاہئے۔ اُس لفنگے مسٹنڈے دیور کا جو دن چڑھے چوپال میں پھر جما کر بیٹھتا ہے تو رات گئے تک یاروں کی محفل میں بانسری بجاتا رہتا ہے، داستانیں کہتا اور سنتا ہے۔ آدھی رات کو گھر آتا ہے، بے سُدھ ہو کر سوتا ہے تو دن چڑھے اٹھتا ہے۔ باسی روٹی پر تازہ مکھن رکھ کر کھاتا ہے۔ گاڑھی لسّی کے ٹھنڈے میٹھے کٹورے پی کر ڈکار لیتا ہے اور نئی نویلی بھابی سے کہتا ہے "بھابی! آج دوپہر کی روٹی میں اتنا گھی ڈالنا کہ بس مزا آجائے۔ ہاں۔"

"تیرے لئے گھی کہاں سے لاؤں اتنا؟" سب سے چھوٹی بھابی نے آنکھیں جھکا کر کہا "تھان پر کون سی بھوریاں باندھ رکھی ہیں تو نے؟"

"یہ بات تیری زبان سے پہلی بار سنی اور تیرے منہ سے کچھ اچھی بھی نہیں لگی بھابی!"

"کیوں بے؟" بھابی نے مہین آواز میں چمک کر پوچھا۔

"بھابیاں تو بڑی بہنوں کے آنچل کا ٹھنڈا سایہ ہوتی ہیں۔ ماں زندہ ہوتی تو اتنی کڑوی بات نہ کہتی۔"

"لو، میں نے اتنی کڑوی بات کہہ دی کہ تجھے اُچھو آگیا۔ تُو تو پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا۔" چھوٹی بھابی نے اپنی اوڑھنی کے رنگین پلو سے آنکھیں پونچھ کر کہا۔

سب سے بڑی بھابی نے آکر کہا "کیوں ری! جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تیرے بیاہ کو اور تو ابھی سے اس گھر کی مالک بن بیٹھی ۔ واہ جی واہ! یہ رتا ساتھا جب خدا بخشے، اس کی ماں فوت ہو گئی ۔بچوں کی طرح پالا ہے اسے آج تک۔ جا بھیا جا کنوئیں پر۔ تیرے لئے گھی میں گوندھ کر وہ روٹی پکاؤں گی کہ ہونٹ چاٹتا رہے گا۔" وحیدہ نے چھوٹی سی نئی نویلی بھابی کو جو اس کی ہم عمر بھی تھی، چھیڑنے کی غرض سے کہا "بھابی! تیری زبان سے تو دودھ شہد کی نہریں بہنی چاہیئے تھیں، تو تو ابھی سے زہر ٹپکانے لگی۔"

اس رات نئے بیاہے ہوئے بھائی کے کان میں نئی نویلی دلہن نے کچھ سرگوشی کی ۔کاجل لگی آنکھوں میں نیر چھلکا کر کچھ کہا مہندی لگے ہاتھوں سے اوڑھنی کا پلو بار بار آنکھوں کی طرف لپکا ۔سہاگ کی تازہ اور رنگین چوڑیاں چھنکیں ۔صبح جب بھائی کنوئیں پر جانے لگا تو وحیدو ابھی تک سویا ہوا تھا ۔اُس نے جھنجھوڑ کر اُسے جگایا۔ "کیوں بے تاجے! تو ہر وقت سوتا ہی رہے گا، یا کچھ کام بھی کرے گا" تاجے نے کروٹ بدلی ۔بھائی، جو اس سے صرف تین سال بڑا تھا غصے میں آکر چنگھاڑا "اٹھ! سارے جہان کی نیند کا ٹھیکہ تو نے لے رکھا ہے کیا" تاجے نے اٹھ کر آنکھیں ملیں۔ گھور گھور کر دیکھا ۔ابھی تو صبح کا اندھیرا بھی دور نہ ہوا تھا ۔اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اکبر! کیا بات ہے؟"

"بات کیا ہے! کنوئیں پر چل ۔گھی میں گندھی ہوئی روٹیاں کھانی ہیں تو کام کرنا پڑے گا۔"

"ہوں!" تاجے نے یکا یک جاگ کر کہا "تو بھابی نے تیرے کانوں میں زہر ٹپکا دیا؟"

"زہر!" بھابی نے ہونٹ بھینچ کر کہا "تو دنیا بھر سے نیارا تو تو نہیں ۔اِس دنیا

کی ریت ہے، جو کرے گا کھائے گا"۔

اُس دن "ناجا منہ اندھیرے کنوئیں پر پہنچا تو سب سے بڑے بھائی نے حیران ہو کر پوچھا۔"آج تو نے منہ اندھیرے اٹھنے کی ہمت کیسے کر لی؟"

"اکبر نے کہا تھا جو کرے گا وہ کھائے گا۔"

"اکبر نے؟"

"کوئی بات نہیں بھیا! نئی نویلی بھابی کا سہاگ ابھی نیا نویلا ہے۔ چار دن کی موج ہے۔ آج سے اکبر کی جگہ میں کام کیا کروں گا۔"

"اکبر کون ہوتا ہے تجھے کچھ کہنے والا؟ جا، جا کر موج میلہ کر۔ تیرے دن ابھی کھیلنے کودنے کے ہیں۔"

"نہیں بھا! میں تو آج سے رات کو بھی کنوئیں پر رہا کروں گا۔ اکبر رات کو ہمیشہ گھر سویا کرے گا۔" ناجے نے تھوڑا سا شرما کر کہا۔ اور بڑا بھائی ہنس پڑا۔ "تیری بات بھی سچ ہے۔ چل اکبر کو بھی چار دن موج میلہ کر لینے دو۔"

ایک رات جب میں گاؤں آیا تو گاؤں تنہا اور اداس معلوم ہوا۔ میرا راستہ چوپال میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ اور چوپال ویرانوں کی طرح سنسان تھا۔ میں یعنی ڈی۔ ایم۔ ناز بھی کچھ اداس اور ملول سا ہو گیا۔ میں تو گاؤں میں محبت اور گرمی کی تلاش میں آیا کرتا ہوں۔ ہمیشہ دو مہینے مسلسل شہر میں رہ کر جی بھی اُکتا جایا کرتا ہے۔ یہ تو عین فطرت ہے۔ خیر اُس رات میں سیدھا گھر چلا گیا۔ صبح ناجے کے کنوئیں پر جا پہنچا۔ ناجا میلا سا تہبند باندھے بیلوں کے لئے چارا کتر رہا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھا تو مسکرانے لگا۔ میں نے پوچھا "اوئے ناجے! کیا بات ہے؟"

"کیا بات ہے دینے! چارہ کتر رہا ہوں۔" ناجے کو کیا پتہ کہ میں دین محمد سے ڈی۔ ایم۔ ناز بن چکا ہوں۔

"یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔ رات چوپال بھوتوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔"

"اکبر کی نئی نئی شادی ہوئی ہے نا۔"

"پھر اس کا چوپال سے کیا تعلق؟"

"تیری عقل گھاس چرنے گئی دینے؟ اکبر کو چند دن موج میلہ کرنے کی اجازت دے رہا ہوں۔"

"دیکھو ناجے! مجھے دینا مت کہا کر۔ میرا پورا نام دین محمد ہے اور آج کل میں ڈی ایم۔ ناز کے نام سے مشہور ہوں۔" میں نے منہ لٹکا کر کہا۔

"اچھا اچھا!" ناجے نے خوب کھل کر قہقہہ لگایا۔ "ڈی۔ ایم۔ ناز... یہ رعب کسی اور پر ڈالنا۔ میں تو اس دینے کو جانتا ہوں جو میرا لنگوٹیا ہے۔ ڈی ایم ناز..." میں نے بات کاٹ لی۔ اگر میں بات نہ کاٹتا تو شاید ناجا ڈی۔ ایم۔ ناز کو ایک عدد گالی سے بھی نواز دیتا۔

"ذرا بھائی سے پوچھ لے تو چل گاؤں میں۔ میں بھی تو دو گھڑی موج میلہ کر لوں۔ پھر میں تیرے لئے ایک بڑی اچھی چیز بھی لایا ہوں۔"

"دیکھوں تو بھلا۔"

"وہ تو گاؤں میں ہے۔"

"میں گاؤں نہیں جاؤں گا۔ میں چار دن اور چار رات سے گاؤں نہیں گیا۔"

"آج میرے لئے چل۔ کہے تو میں خود تیرے بھائی سے پوچھ لوں۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وحیدو لاڈلے بھی ہوتے ہیں اور ضدی بھی۔ اگر وہ کسی بات پر اڑ جائیں تو لاکھ منتیں کرو نہیں مانتے۔ میں ناراض ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ اس نے بڑی محبت سے میرا بازو پکڑ کر پھر مجھے بٹھا لیا۔ اس نے سب سے چھوٹی بھابی کے طعنوں مہنوں کا ذکر کیا اور پھر اکبر کی خشونت کا جس نے اس کے دل پر چھریاں چلا دی تھیں۔ اس کی

آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں باوجود تخلص کے شاعر نہیں، لیکن تاجا تخلص نہ ہونے کے باوجود شاعر ہے کیونکہ وہ بہت حسّاس ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا اُس کے دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور پھر وہ اپنے دل کی کیفیات کو اس شدّت سے پیش کرتا ہے کہ اس کی ایک ایک بات شعر معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے تو میں اسے شاعر کہتا ہوں۔ گاؤں کا شاعر، جو وحیدو بھی کہتا ہے، اس رات میری خاطر چوپال میں آ ہی گیا۔ احمد نے الغوزے بجائے۔ شرفو نے مرزا صاحباں سنایا۔ تاجا بانسری کی لے پر خوب چہکا۔ میں نے پنجابی کے ایک نئے شاعر دائم کا کلام سنایا۔ گانے بجانے کے بعد داستانوں کا دور چلا۔ کچھ جگ بیتیاں، کچھ آپ بیتیاں۔ جوان دلوں کی دھڑکنوں کے افسانے۔ گندم، باجرے، مکّی اور کماد کے کھیتوں میں سے بل کھانے والی پگڈنڈیوں پر بکھری ہوئی کہانیاں جو آنکھوں کے راستے دل میں داخل ہوئیں اور روح میں رچ کر ہونٹوں پر آ گئیں۔ جب رات بھیگ گئی تو میں نے اپنی ڈب سے وہ تحفہ نکالا جس کا وعدہ تاجے سے کنوئیں پر کر آیا تھا۔ یہ آبنوس کی بنی ہوئی بانسری تھی جو کاریگر نے میری فرمائش پر بنائی تھی۔ تاجا اندھیرے میں اسے دیکھتا رہا اور اس پر ہاتھ پھیر پھیر کر اسے پیار کرتا رہا۔

صبح میں شہر جانے کے لئے اٹھا تو سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ ماں مجھ سے پہلے اٹھ چکی تھیں۔ دودھ بلو کر تازہ مکھن نکال چکی تھیں۔ مکھن میں تلے ہوئے پراٹھے دہی سے کھائے۔ اور تازہ لسّی کے دو کٹورے پی کر گھر سے نکل آیا۔ اندھیرا صبح کے سوئے سوئے دھلے اُجالے میں بدل چکا تھا۔ اور ہر گھر سے گھمک گھوں دودھ بلونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گلی کے ایک نکڑ پر میں نے زینی کو دیکھا اور اسے پہچان نہ سکا۔ پہچانتا کیسے؟ زینی کی ایک مدھ ماتی نگاہ پر گلی کا ایک ایک موڑ بھول بھلیاں بن گیا

تھا۔ روشن صبح کا چہرہ بجلیوں کے ہالۂ نور میں دمکتا ہوا ہیرا تھا کہ اُس پر نگاہ نہ ٹکتی تھی اور زینی صبح کی رانی تھی کہ شبنم کا شہد پی کر اٹھی تھی، اور ایکا ایک پروان چڑھ گئی تھی۔ کلی کھل کر پھول بن چکی تھی اور ٹھیک کی آواز خاموش فضاؤں میں نغمے کی طرح منتشر تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا اور صدیوں تک گردشِ دوراں میں چکر لگاتا ہے۔

میں، ڈی۔ ایم۔ ناز، ڈھولن گاؤں کی زینی کی ایک اُچٹتی ہوئی مست الست نگاہ پر دینا بن چکا تھا۔

کسی نے میرے کانوں میں چیخ کر کہا: "دینے او دینے!"

میں نے ذرا سا چڑ کر کہا: "میں ڈی۔ ایم۔ ناز ہوں۔"

"ڈھولن گاؤں میں تو صرف دینا ہے۔"

"میں دینا ہوں۔ مجھے دینا ہی کہو۔ میں ڈی۔ ایم۔ ناز بن کر کیا کروں گا؟ اگر ڈھولن مجھے دینے کی حیثیت سے قبول کرے تو میں ڈی۔ ایم۔ ناز پر سو لعنت بھیجنے کو تیار ہوں۔"

تب ڈھولن کی گلیوں نے مجھے آزاد کر دیا۔ پھول پھلیوں کے جالے ٹوٹ گئے۔ میں نے شہر کی طرف قدم بڑھایا۔ ڈھولن درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن زینی ہر سڑک کی ہر موڑ پر مجھے ملی۔ درختوں کے ہر جھنڈ کے پیچھے سے آنکلی۔ کبھی ایک کرن کی تھرکتی ہوئی چلبلاہٹ میں زندہ ہوئی کبھی بلبل کی ایک تان میں چونک کر جاگی، کبھی گھاس کا جنگلی پھول بن کر جھومی، کبھی نسیم صبح کا ایک مست جھونکا بن کر آئی۔ شہر پہنچ کر بھی زینی نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ میں کئی دن تک دینے سے ڈی۔ ایم۔ ناز بننے کی جرأت نہ کر سکا۔

فرم کے اسسٹنٹ مینیجر نے ایک دن مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔۔

مسٹر ڈی - ایم - ناتھ"۔

"جناب" میں نے ادب سے جھک کر جواب دیا "میرا نام ..."۔

"کرسی پر بیٹھیے"۔ اس نے میری بات کاٹ کر کہا - میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہم آپ کے کام سے بہت خوش ہیں"۔ میں شکریہ ادا کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکا۔

"ہم مینیجر صاحب سے بات کریں گے - شاید آپ کو تنخواہ میں کچھ ترقی مل جائے"۔ میں نے اسسٹنٹ مینیجر صاحب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت کر لی - دو ننھی ننھی آنکھیں دور کسی کنوئیں کی تہ میں چمک رہی تھیں اور بلڈاگ کے سے چہرے پر چیچک کے گڑھے تھے - پہلوانوں جیسا مضبوط جسم، بڑی پاٹ دار آواز - اسسٹنٹ مینیجر صاحب کا سارے کارخانے پر رعب تھا - میں شکریہ کیا ادا کرتا، تھر تھر کانپ رہا تھا۔

جب میں اسسٹنٹ مینیجر کے کمرے سے باہر نکلا تو گنجے کلرک نے جو مجھ سے سینئر تھا بڑے تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملایا - میں حیران ہو گیا تو اس نے مجھے پاس کی کرسی پر بٹھا کر پوچھا "اسسٹنٹ مینیجر صاحب سے کیا بات ہوئی؟"

"وہ میرے کام سے بہت خوش ہیں"۔

"بس؟"

"نہیں - ترقی کے لئے سفارش کرنے کا وعدہ بھی کرتے ہیں"۔

"مبارک باد! لیکن .... کوئی شرط پیش کی انہوں نے؟"

"نہیں تو"۔

"پھر انتظار کیجئے - ترقی ملنے سے پہلے ..."۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے پوچھا "ترقی ملنے سے پہلے کوئی شرط پیش کی جاتی ہے اور وہ شرط کیا ہے؟"

"آپ شادی شدہ تو نہیں ہیں؟"

"نہیں۔"

"مبارک باد! آپ کے پیشرو یعنی جس کی جگہ پر آپ یہاں آئے ہیں، صرف اسی وجہ سے ترقی سے محروم ہوئے بلکہ نوکری سے بھی نکالے گئے کہ وہ شادی شدہ تھے۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"بھائی! اسسٹنٹ مینیجر صاحب کے ہاں خدا کے فضل سے لڑکیوں کی کھیپ کی کھیپ ہے۔ وہ آپ کو دامادی کا فخر بخشنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ خوش ہیں؟"

میں خوش تو کیا ہوتا البتہ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ کرسی ہنڈولے کی طرح گھومی اور مجھے چکر آ گئے۔ زینی نے طنز بھری مسکراہٹ سے کہا "اتنی سی اوقات پر عشق کرنے چلے تھے؟ واہ!" اور میں دوسرے ہی دن پندرہ روز کے دورے پر نکل گیا۔ قریہ قریہ گھومتا رہا لیکن سفر کے ہر موڑ پر زینی مجھے ملتی رہی اور اسسٹنٹ مینیجر کا بلڈاگ سا چہرہ گھور کر اُسے بھگا دیتا۔

دورہ ختم کرنے کے بعد میں گاؤں گیا تو حسبِ معمول رات کا وقت تھا۔ میرا گاؤں تنہا اور اُداس تھا کیونکہ چوپال خالی تھا۔ اور سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میں نے تاجے کے دروازے پر آواز دی تو تاجے کی بڑی بھابی نے کہا "دین محمد کیا کام ہے؟"

"تاجا کہاں ہے؟"

"گھر میں تو نہیں ہے۔"

"پھر کیتوپٹیں پر ہو گا۔"

"نجانے کیا پتہ ہے دینے! تاجے کو کچھ کر دیا ہے اس کلموہی ڈائن نے۔"

"کون کلموہی؟"

"وہی اکبر کی لگائی... ڈائن... طعنے مہنے مار کر سینہ چھلنی کر دیا ہے میرے سوہنے ویر کا۔"

"اب کہاں رہتا ہے وہ؟"

"کیا بتاؤں۔ خود اُسی سے پوچھ لیتا۔" بس گھر چلا گیا۔ ماں سے مل کر اور دو لقمے کھا کر تاجے کی تلاش میں نکل گیا۔ تاجا کنوئیں پر بھی نہیں تھا۔ میں مایوس ہو کر لوٹا تو مائی کے ٹبے کی طرف سے بانسری کی آواز آئی۔ اس ٹبے کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے ارد گرد کیکر اور بیری کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ بچپن سے سنتے آئے تھے کہ یہ جگہ بکی ہے۔ یہاں چڑیلوں کا ڈیرا ہے۔ تپتی دوپہر کو اور آدھی رات کو سنسان خاموشیوں میں اُس طرف کا رُخ کرنا بھی دل گردے کا کام تھا۔ اب کچھ عرصے سے اس پر ایک سائیں کا ڈیرا تھا اور تاجے کی بانسری کی آواز اُسی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے رات کے اندھیرے میں اُس طرف قدم بڑھایا تو جی دہلا۔ جھنڈ سے باہر کھڑے ہو کر میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پکارا "تاجے!" دوسری تیسری پکار پر تاجے نے جواب دیا "کون؟"

"میں ہوں دین محمد۔"

"دینے!" تاجے نے کہا "تم آگے آ جاؤ گے یا میں تمہارے پاس آ جاؤں؟"

"نہیں آ جاؤ۔" کچھ دیر کے بعد تاجا اندھیرے میں یوں نکلا جیسے کوئی اسرار۔ گھپ اندھیرے میں اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بولا۔ "ڈر گئے کیا؟"

"ہاں تاجے! تو بھوتوں کے ڈیرے میں کیوں آ گیا؟"

"سائیں مستانے سے ملنے آ گیا تھا۔ اس کی فرمائش پر بانسری بجا رہا تھا۔"

"پکلے! کہیں کان پھڑوا مندرے پہن کسی بالناتھ کا چیلہ تو بننے کا خیال نہیں۔
وہ کیا پتہ دیتے!" تاجے نے آہ بھر کر کہا۔ اُس کی آواز میں بڑی گھمبیرتا تھی۔ جیسے
روح کے پاتال سے نکلی ہو۔

"کیوں چھوٹی بھابی کے طعنوں مہنوں نے ...!" میں نے بات ادھوری چھوڑ
دی۔ ہوا کا ایک جھونکا بیری اور کیکر کے درختوں میں سے سرسراتا ہوا گذر گیا۔ میں
نے گھپ اندھیرے کو لرزتا ہوا محسوس کیا۔ ایک انجانی آواز نے بڑی دبی زبان
سے میرے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ میں اس کا مطلب تو نہ پاسکا، پر میرے رونگٹے
کھڑے ہو گئے۔ "تاجے! چل گاؤں چلیں۔ چوپال میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" پگڈنڈی
کا کوئی موڑ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ اندھیرا گہرا تھا۔ اور راستے میں تاجے نے پوچھا۔
"دینے! رانجھا تخت ہزارہ چھوڑ کر جھنگ سیالاں کیوں آیا تھا؟"

"تو مجھ سے پوچھتا ہے؟ رانجھا ہیر سے ملنے آیا تھا۔"

"نہیں دینے! بھابیوں نے اُسے طعنے دیئے۔ اگر بھابیاں اُسے طعنوں کے تیر نہ
مارتیں تو وہ ساری عمر... تخت ہزارے میں بانسری بجا بجا کر بتا دیتا۔"

"وہ ڈھولن کے رانجھے!" میں نے ذرا چمک کر کہا۔ "تو چھناں (چناب) پار کر کے کس
جھنگ سیالاں میں جائے گا؟"

"دینے!" تاجے نے میرے بازو پر ہاتھ کی گرفت سخت کرتے ہوئے کہا "اور کیا!
میں نے تو کب کا چھناں پار کر لیا ہے۔"

میرے تن بدن میں ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ ایک برفیلا جھونکا میرے جسم
کو پار کر گیا۔ میں نے جی کڑا کر کے پوچھا۔

"چھناں پار تو نے کسی ہیر کو بھی پایا؟ یا پھولوں کی سیج ....؟" میں بات
پوری نہ کر سکا۔

"دینے! تیری دی ہوئی بانسری کے ایک نغمے نے ہیر کو جنم دیا۔ ہیر چھناں کے اس پار کھڑی تھی۔ ڈھولن کی ایک گلی میں رانجھا تھا، دوسری کے ایک موڑ پر ہیر، اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔"

"پھر؟" میں نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔

"رانجھا چھناں پار کر گیا۔"

"تیری ہیر کون ہے؟" میری آواز لرز رہی تھی۔

"زینی۔" ایک تیر میرے سینے میں پیوست ہو گیا۔ میں نے خون کے سمندر میں ڈوب کر ہاتھ پاؤں مارے، پر میں لہروں کے جبڑوں سے بچ کر نہ نکل سکا۔ صبح کے اجالے اور اندھیرے میں میں نے گلی کے اس موڑ پر زینی کو دیکھا۔ زینی کی آنکھوں میں صبح کی روشنی تھی۔ صبح کے تارے کا لرزتا ہوا کیف تھا۔ خنک ہوا کا شہد سے بھرا رس تھا پر میں جو ڈھولن کا دینا ہوں اور ڈھولن سے باہر ڈی۔ ایم۔ ناز ہوں نجانے پھر دینا کیوں نہ بن سکا۔ زینی کی وہ نظر جو مجھے ڈی۔ ایم۔ ناز سے دینا بنا گئی تھی پھر مجھے وہ کایا کلپ عطا نہ کر سکی۔ میں نے اس صبح اس ایک نظر کے سہارے نیلے آسمانوں کی سیر کر لی تھی، آج یہی نظر مجھے پاتال کی دلدل میں لے گئی تھی۔

دینے سے ڈی۔ ایم۔ ناز بننا کتنا آسان تھا۔

ڈی۔ ایم۔ ناز سے دینا بننے کے لئے تو کسی زینی کی نگاہِ کیمیا گر کی ضرورت تھی۔

اس ایک نگاہ سے گاؤں کا دینا ڈھولن کا رانجھا بن چکا تھا۔ شاید ڈھولن کا دینا جو شہر کا ڈی۔ ایم۔ ناز تھا۔ بانسری ہاتھ میں لے کر مائی کے ٹبے پر سائیں مستانے سے یہ جوگ لینے کو تیار نہ ہوتا۔ یہ تو کسی سرپھرے کا کام تھا۔

جب میں گاؤں سے شہر جا رہا تھا تو زینی نے پھر میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی وہ مجھے ہر موڑ پر ملی۔ ہر گھنے درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ موجود ہوئی۔

میرا دل بھر آیا۔ میری آنکھیں رو دیں۔ پھر میں نے سوچا، ہیریں قربانی دیئے بغیر نہیں ملا کرتیں۔ ہاں! کھیڑے اپنی دولت اور طاقت کے زور پر انہیں رانجھوں سے چھین لے جایا کرتے ہیں۔ میں اگر ڈھولن کا رانجھا نہیں بن سکتا تو کھیڑا ضرور بن سکتا ہوں۔ میں میٹرک پاس ہوں اور ایک سو بیس روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ میں اگر ذرا سا اشارہ بھی کر دوں تو زینی کا ڈولا اپنے ہاں لا سکتا ہوں۔ سوچ کے اس مرحلے پر میں نے ایک ٹنڈ منڈ درخت سے ٹیک لگالی۔ آنکھیں میچ لیں۔ اور دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ زینی ایک خشک پتے کی طرح راکھ ہوگئی۔ زندگی ہرے بھرے پتوں کا لباس اتار کر ٹنڈ منڈ ہوگئی۔ اور ننگ دھڑنگ وحشی بھتنوں کا ناچ ناچنے لگی۔ "دینے! تو اپنے دوست، گاؤں کے نتلو تاجے سے، جو کبھی دھیدو تھا اور اب رانجھا بن چکا ہے، کھیڑوں کا خونی کھیل نہیں کھیل سکتا"۔ شہر پہنچ کر میں نے اسسٹنٹ مینیجر صاحب کے ہاں ایک شام کو چائے پینے کا وعدہ کر لیا۔ گنجا کلرک مکاری سے مسکرا کر کہنے لگا۔ "تو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا"۔ اور چند دن کے بعد میں نے دو تین ترقیاں حاصل کر لیں اور اسسٹنٹ مینیجر صاحب مجھے ہونے والا داماد سمجھ کر مسٹر ڈی۔ ایم۔ ناز سے صرف "ناز بیٹا" اور "برخوردار" کے الفاظ سے نوازنے لگے۔

چوپال پھر 'تنہا' خالی اور اداس تھا! میرا دل سیسے کا بے جان ٹکڑا بن گیا۔ میں تاجے کے گھر نہ گیا۔ میں نے مائی کے ٹبے کا رخ بھی نہ کیا۔ گلی کے ایک موڑ پر شرفو ملا۔ اس نے کہا "چودھری دین محمد! اب تو زندگی میں مزا نہیں رہا"۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"تاجے نے چوپال میں آنا بالکل چھوڑ دیا ہے"۔

"تاجے کو کسی باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہے؟"

"چودھری! تجھے پتہ نہیں وہ تو سائیں مستانے کا چیلا بن چکا ہے۔ دن رات اس کے

پاس رہتا ہے ۔ رات ہوتے ہی بانسری کو منہ لگاتا ہے اور وچھوڑے (فراق) کے گیت گاتا رہتا ہے۔"

"کیوں؟ وچھوڑا کیسا؟"

"چودھری! تاجے نے رانجھے کا روپ بھر لیا ہے۔"

"اُسے کوئی ہیر بھی ملی؟" میں نے جان بوجھ کر بھولا بنتے ہوئے پوچھا۔

"بھولے بادشاہو! ہیر کے بغیر بھی کوئی تاجا رانجھا بنتا ہے، بھلا۔ وہ زینی جو ہے نا.... بند کلی کی باس کی طرح گاؤں کی نظروں سے اوجھل تھی پھر جب بند کلی کھلی تو سب سے پہلے تاجا اس کلی کا بھنورا بنا۔"

"شد فو! کیا پتہ! نظر کا تیر پہلے کس کے سینے میں پیوست ہوا۔" میں نے آہ روک کر کہا۔

"پر چودھری! اب تو دنیا جان گئی ہے کہ ہیر کون ہے اور رانجھا کون ہے؟"

"ہاں! ہاں! تاجے کو رانجھے کا سوانگ بھرنے کی کیا ضرورت تھی۔ زینی کون سی محلوں کی رانی ہے کہ تاجے کی کٹیا میں نہیں آسکتی تھی۔"

"کیا بتاؤں چودھری! تاجا بھی کچھ عجیب بادشاہ بندہ ہے ۔ اپنے عشق کو مشک بنا کر پھیلایا ڈھول گاؤں میں ۔ اب بچے بچے کی زبان پر اس کا قصہ ہے ۔ زینی کے بھائیوں نے کہا ہے زینی کو کنوئیں میں پھینک دیں گے پر اس کا ڈولا تاجے کے گھر نہیں جائے گا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"چودھری! دُنیا والوں کو پیار کرنے والوں سے اللہ واسطے کا بیر ہوتا ہے اور اب تو تاجے اور زینی کا قصہ چاروں کھونٹ بکھر گیا ہے ۔ کوئی وارث شاہ اس کو بھی لے اُڑے گا۔"

اندھیرا گہرا ہو گیا تو گھر اپنی آمد کی اطلاع دے کر میں تاجے کے کنوئیں پر چلا گیا۔
تاجے کا بڑا بھائی کنوئیں پر موجود تھا میں نے کہا "بھیا! تاجے کو کیا ہو گیا ہے؟ مائی کے ٹبے پر سائیں مستانے کے پاس ڈیرا لگا کر بیٹھ گیا ہے۔ زینی کون سی جھناں پار کی شہزادی تھی کہ تاجے کو جوگ لینا پڑا۔ تو زینی کے گھر والوں کے پاس جا اپنی برادری کے لوگ ہی تو ہیں۔"
تاجے کے بھائی نے ایک دو لمحے سوچ کر کہا "دین محمد! لوگ کہتے ہیں تاجے نے ڈھولن کی خاک اڑائی ہے۔ رانجھے تو باہر سے آتے ہیں۔ کوئی اُن کا سنگی ساتھی نہیں ہوتا، پر اپنے گاؤں کے رانجھے کو لوگ کیا کہیں۔ میں کل زینی کے باپ کے پاس جاؤں گا۔ میرا جی کہتا ہے وہ نہیں مانیں گے اور زینی کے گھر والے مان گئے تو تاجا نہیں مانے گا۔"
"وہ کیوں بھا؟ تاجا بھلا کیوں نہ مانے گا؟"
"دین محمد! کچھ لوگوں کی رگ دنیا جہان سے نیاری ہوتی ہے۔ تاجے کو زینی جو لیوں سینتے داموں مل گئی تو اس کا پیار ڈال سے ٹوٹے ہوئے پھول کی طرح مرجھا جائے گا۔ کچھ لوگ پھول کو ٹہنی سے توڑ لیتے ہیں۔ کوئی سر پھرا ایسا بھی ہوتا ہے جو شاخ کو کٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ہے۔ کلی چٹکتی ہے پھول بنتی ہے۔ مرجھاتی ہے اور پھر خاک ہو کر خاک میں مل جاتی ہے پر یہ لوگ بلبل کی طرح گاتے گاتے خود بھی اس کے ساتھ خاک میں مل جاتے ہیں۔" تاجے کے بھائی کی آواز میں غم لرز رہا تھا۔
میرے بدن میں جھرجھری سی آئی۔ میرے کان میں ایک چونکی ہوئی آواز نے کہا۔ "ڈی۔ ایم ناز! تجھے کیا پتہ کہ رانجھے کس مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ تو تو مٹی کا کیڑا ہے، پر لگا کر نیلی فضاؤں میں اڑنا کیا جانے؟"
"بھا! تو نے سچ کہا" ڈھولن کے دیتے نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔

"میں کل صبح زینی کے باپ کے پاس جاؤں گا۔ دین محمد! تو تاجے سے مل۔ پھر دیکھ کیا بنتا ہے۔"

میں علی الصبح اٹھا۔ ابھی مرغ نے اذان بھی نہ دی تھی۔ مائی کے ٹبے پر سوئی سوئی سنسان خاموشیوں کا راج تھا۔ درخت سوئے ہوئے تھے۔ درختوں کے جھنڈ کا گہرا سایہ سویا ہوا تھا۔ مجھے مائی کے ٹبے سے ڈر لگا۔ میں درختوں کے جھنڈ میں سے گذرا تو ٹہنیاں میرے سر سے ٹکرا کر اوس کے ٹھنڈے چھینٹے دے گئیں۔ اور پھر ایک جگہ جہاں گھاس کا گیلا فرش تھا۔ میں نے تاجے اور زینی کو دیکھا جو ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے ایک درخت سے ٹیک لگا کر سو رہے تھے۔ تاجے کی بانسری ایک طرف گھاس پر پڑی تھی۔ میں ٹھٹک کر دو قدم دور کھڑا ہو گیا۔ دو قدم کے فاصلے پر معصومیت نے ایک پاکیزہ حصار کھینچ دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے دو قدم اور بڑھائے تو جل جاؤں گا۔ بھسم ہو کر راکھ ہو جاؤں گا۔ میں دبے پاؤں لوٹ آیا۔ میرے پاؤں کی اگر ذرا سی بھی چاپ آئی تو تقدس کی وادی بھک سے اڑ جائے گی۔ پیار اور سپنوں کے سنہری جال ٹوٹ جائیں گے۔ دھنک تڑخ کر زمین پر آ رہے گی اور جھنڈ سے دور ہٹ کر پگڈنڈی کے ایک موڑ پر بیٹھ گیا۔ یکا یک مرغ نے دور کہیں اذان دی۔ جادو ٹوٹ گیا۔ درختوں کی پھننگیں لہرائیں۔ مشرق کا اندھیرا لرزا اور اجالوں کے مدھم دیئے روشنی ہوئے اور پھر زینی ایک سائے کی طرح میرے پاس سے گذر گئی۔

میں نے کہا "تاجے! یہ تو نے کیا سوانگ بھر لیا؟ اب تجھے نے اس وقت جوگ لیا جب ہیر کا ڈولا کھیڑوں کے ہاں پہنچ گیا تھا۔"

"دینے! رانجھے اپنے زمانے کے راجہ ہوتے ہیں۔ جوگ تو ان کے من کی موج ہے۔ جب چاہا لے لیا!"

میں نے ذرا غصے میں آکر کہا "تاجے! تو ہیر رانجھے کا ڈرامہ کھیل رہا ہے یا پیار کی منزلیں طے کر رہا ہے، اس سے کچھ سروکار نہیں لیکن تو نے ڈھولن کی عزت مٹی میں ملا دی ہے!"

"میں کسی ڈھولن کی مٹی کا کیڑا نہیں، تو کس ڈھولن کا قصہ لے بیٹھا ہے؟"

"تو ایک اشارہ کر دیتا تو زینی کا ڈولا تیرے گھر آپہنچتا۔ زینی کون سے محلوں کی رانی تھی؟"

"محلوں کی رانی! وہ تو دنیا جہان کی رانی ہے۔ میرے دل سے پوچھ دینے! اس میں کس کا راج ہے!"

"زینی تیرے دل کی رانی ہے پر وہ ڈھولن کی عزت بھی تو ہے!"

"دینے!" تاجے نے ذرا سختی سے کہا "میں بھی ڈھولن کی عزت میں تمہارا ساجھی ہوں!"

"پھر یہ رات کے اندھیرے میں تاجے اور زینی کا درختوں کے جھنڈ میں ملنا اور ایک دوسرے کے....!" ڈی۔ ایم۔ ناز اپنی بھری بات پوری نہ کر سکا۔ تاجے نے اس کے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تو میرے سچے پیار کی ہتک کر رہا ہے کیدو!"

ڈی۔ ایم۔ ناز کی آنکھیں اُبل آئیں۔ تاجے نے اس کے گلے پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ میں نے کہا "تاجے! یہ بات تیرے دینے نے نہیں کہی تھی۔ یہ تو ڈی۔ ایم۔ ناز کے دل کا کیچڑ تھا جو اس کے ہونٹوں پر آگیا!"

"تیرے ڈی۔ ایم۔ ناز....!" تاجے نے ہونٹوں پر آئی ہوئی گالی نگل کر کہا۔

دینے! جب تو ڈھولن میں آیا کرے تو ڈی۔ ایم۔ تاز کو وہیں شہر کی گندی نالیوں میں چھوڑ آیا کر۔"

زینی کے بھائیوں نے تاجے کے بڑے بھائی کی سخت بے عزتی کی۔ تاجے کے بھائی نے سر جھکا کر سب کچھ سہہ لیا۔ زینی کے باپ نے کہا "اوئے! تو اب آیا ہے جب میری اجلی پگڑی خاک میں مل چکی ہے۔ جا اب زینی کا بیاہ کسی چمار سے ہو گا۔ وہ اب تیرے گھر نہیں جائے گی۔" پنچایت میں بھی اُسے بری بری باتیں سننا پڑیں۔ میرا جی دکھا، پر میں کس کھیت کی مولی تھا۔ زینی پر کڑے پہرے بٹھا دیئے گئے اور رمائی کے ٹبے پر تاجا بانسری بجا بجا کر زینی کو بلاتا رہا۔ ستاروں کی روشنی میں زینی اپنے آنگن میں پڑی بانسری کی لے پر نیر بہاتی رہی اور آسمان سے شبنم کی بوندیں گرتی رہیں۔ یہ ستاروں کے آنسو!

میں اگلے دن شہر جانے کے لئے صبح سویرے گھر سے نکلا۔ گاؤں حسب معمول سویا ہوا تھا اور بیدار بھی تھیں تو گھوں گھوں مدھانیاں دہی سے مکھن جدا کر رہی تھیں۔ گلی کے نکڑ پر مجھے زینی ملی۔ آج اس کی ایک نگاہِ غلط انداز نے مجھے بگولا بن کر نہ اڑایا۔ میں نسیم صبح کے اس جھونکے کی طرح بجھ کر رہ گیا جس کا راستہ ریت کے ایک تودے نے روک لیا ہو۔ آج زینی کی نگاہوں میں الھڑ دوشیزگی کا بولتا ہوا جادو نہیں تھا اور پھر یہ نگاہیں بجھی بجھی بھی تو نہ تھیں۔ میں ان نگاہوں کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا کیونکہ یہ زمین پر تھیں لیکن آسمان سے بھی ان کا رشتہ قائم تھا۔ پیار کے اس مرحلے پر زینی کا جسم اس کی روح سے علیحدہ معلوم نہ ہوا۔ زینی کا جسم جس نے پیار کا نغمہ سنا تھا اور اس نغمے کو اپنے اندر رچا لیا تھا اور اب جسم اور روح میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا تھا۔ مجھے تو زینی کا انگ انگ تاجے کی بانسری

کا نغمہ محسوس ہوا جیسے میرے کان سن رہے تھے اور جو میری روح میں رچ رہا تھا اور کثافتیں دھل دھل کر صاف ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے بعد کانپ کر میں نے شہر کی راہ لی۔

ڈھولن جو اندھیرے میں ہمیشہ اداس اور تنہا معلوم ہوتا تھا آج راکھ کی طرح بجھا بجھا لگ رہا تھا۔ کوئی دیا بھی تو روشن نہ تھا۔ چوپال سائیں کر رہا تھا۔ میں نے شرفو کے گھر جا کر آواز دی۔ شرفو باہر آیا تو میں نے پوچھا۔ "شرفو! آج تو گاؤں مفلس کے دیئے کی طرح سر شام ہی سے بجھ کر رہ گیا ہے جیسے اس کی روح نکل گئی ہو۔"

"ہاں چودھری! گاؤں کی روح نکل گئی ہے۔"

"کیوں؟"

"زینی چلی گئی۔"

"تاجا اسے لے کر....!"

"نہیں بھولے بادشاہ! تاجے کے ساتھ نہیں.... اپنے سسرال میں.... ڈھول تاشے اور نفیریوں کے ساتھ....!"

"اور ڈھولن کا رانجھا بانسری بجاتا رہا؟"

"نہیں چودھری! رانجھے نے ڈھولن کی عزت پر اپنے پیار کو بھینٹ چڑھا دیا۔ بیاہ کی رات زینی سہیلیوں کے جھرمٹ سے نکل کر اور سب کی آنکھوں میں دھول ڈال کر مائی کے ٹبے پر جا پہنچی۔ زینی کے بھائیوں نے چھوی ٹکوے ہاتھ میں لے لئے پر گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے کہا "دیکھو! ڈھولن کی عزت خاک میں نہ ملاؤ"۔ تاجے کا بڑا بھائی مائی کے ٹبے پر گیا۔ اس نے اپنی پگڑی تاجے کے پاؤں پر رکھ

دی۔ اور کہا " تاجے! یہ پگڑی تیرے بھائی کی نہیں ڈھولن کے سارے گاؤں کی ہے۔ اس کی لاج رکھ لے "۔ میں نے شرفو کی پوری بات نہ سُنی، پاگلوں کی طرح بھاگا، ٹھوکریں کھاتا، کانٹوں سے اُلجھتا، گرتا پڑتا مائی کے ٹبّے پر پہنچا۔ میں نے دور ہی سے آواز دے کر تاجے کو بلایا۔ تاجے نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیوں دینے! تو مجھے زہر میں بجھے تیر مارنے آیا ہوگا؟"

" ہاں! رانجھے کے بچے! تو نے ڈھولن کی لاج تو رکھ لی پر ڈھولن کے پھول کو غیروں کے ہاتھ میں دے دیا کہ وہ اُسے مَسل کر ہوا میں بکھیر دیں"۔

تاجے نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے کہا "بس، بس، سانپ کے بچے! جا اپنی گندی نالی میں ڈوب مر۔ تو کیا جانے پیار کی ریت کیا ہوتی ہے؟"

سائیں مستانہ تاجے کی آواز سن کر اپنی کٹیا سے نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھنگ گھوٹنے کا ڈنڈا تھا۔ اس نے ڈنڈا ہوا میں لہرا کر کہا "جا جا، دنیا کے کتے! تو میرے ملنگ کو بہلانے پھسلانے آیا ہے "۔

" سائیں بادشاہ! یہ میرا دوست دینا ہے "۔ تاجے نے کہا۔ لیکن اس کا ہاتھ بدستور میرے منہ پر تھا۔ میں نے غصّے سے بھرائی ہوئی گھٹی گھٹی آواز میں کہا " زینی کو منجدھار میں دھکا دے کر تو خود کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ تاجے! کہ اس کے ڈوبنے کا تماشا دیکھے؟ زینی تو ڈھولن کی روح تھی۔ روح نکل گئی۔ اب ڈھولن اپنی عزت کا خالی ڈھول پیٹتا رہے "۔ اور پھر میرا غصہ جلتے بھنکتے آنسوؤں کا دھارا بن گیا۔ شاید ایک قطرہ تاجے کے ہاتھ پر گرا۔ اچانک وہ میرے درد سے واقف ہو گیا۔ اس نے چونک کر اپنا ہاتھ میرے منہ سے ہٹا لیا، پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"دیپتی! ایسا لگتا ہے جیسے تو بھی پیار کی ریت جانتا ہے .... مجھے معاف کر دے دیپتی!.... پہلے تو میں نے جوگ کا سوانگ بھرا تھا۔ اب میں کان پھڑوا مندرے پہن سچ مچ جوگ لے لوں گا۔"

کاغذی پیرہن

آدھی رات کو اُسی مدھر سی سُر نے اُس کے کان میں سرگوشی کی تو اُس کی آنکھ کھل گئی۔

یہ ایک لمبے نام سا سندلیسہ تھا جو متواتر تین راتوں سے ایک پھوار بن کر اُس کے تن بدن پر بکھر جایا کرتا تھا۔ اِس میں من کے دُکھ کا میٹھا سا کیف بھی ہوتا۔ اُس نے اپنے سرہانے کی کھڑکی کھولی تو ایک یخ بستہ بھیگا ہوا جھونکا آیا۔ اُسے کپکپی سی لگ گئی۔ باہر گھور اندھیرا تھا۔

"کھڑکی بند کر دو زرینہ!" شاہدہ نے کہا "بہت سخت سردی ہے"

زرینہ نے کھڑکی بند کر دی تو شاہدہ نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا "تم آدھی رات کو کھڑکی کیوں کھولتی ہو زرینہ؟"

"یونہیں .... شاید...... کمرے کی بند ہوا میں آدھی رات کو گھٹن سی محسوس ہوتی ہے"

"دیکھو زرینہ! مجھے ٹالو مت۔ میں جانتی ہوں تم کھلی کھڑکی میں سے پنچھی بن کر نہیں اُڑ سکتی۔ پھر بھی تم جو کھڑکی کھولتی ہو تو اس میں کچھ راز ضرور ہے"

"نہیں!" زرینہ نے سوئی سوئی آواز میں کہا۔

شاہدہ نے اپنے سرہانے تپائی پر پڑا ہوا لیمپ جلا دیا۔ کمرے میں روشنی پھیلی تو

گھور اندھیرے کا سپنا ٹوٹ گیا۔ زرینہ نے آنکھیں جھپک جھپک کر روشنی کو اپنے من میں بسانا چاہا۔ آنکھوں میں درد کی ایک ٹیس اُٹھی اور من کا میٹھا سا دکھ جاتا رہا تو زرینہ نے سپاٹ سی آواز میں کہا "شاہدہ! میں آدھی رات کو ایک سپنا دیکھتی ہوں۔"

"کون سا سپنا؟" شاہدہ کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور اشتیاق بھی۔

"میرے کانوں میں ایک میٹھی سی سُر گونجتی ہے جیسے آسمانوں سے اُتری ہو۔"

"تم تو سدا کی پگلی ہو۔" شاہدہ نے ہنس کر کہا "سنہرے خواب دیکھنے والی شہزادی چل سو جا۔"

زرینہ سوئی تو گھوڑے بیچ کر سوئی۔ صبح جب وہ آنکھیں ملتی ملتی اُٹھی تو سپنوں والا دریچہ کھلا ہوا تھا اور پائیں باغ میں آم اور ریحان کے درختوں پر رنگا رنگ کے پرندے گا رہے تھے اور اُن کی پھننگوں پر سردیوں کی سنہری دھوپ کانپ رہی تھی۔ وہ گرم چادر اوڑھ کر آنگن میں آئی تو شاہدہ نے پکار کر کہا "زرینہ! ادھر تو آ۔"

"کیوں کیا بات ہے شاہدہ؟"

"کچھ بھی نہیں..... میں تنہائی سی محسوس کر رہی تھی۔"

"آج گھر خالی ہے نا؟"

"چچا ابھی ابھی چائے پی کر نکل گئے ہیں۔ انہیں باہر کچھ کام ہے اور چچی منہ اندھیرے کنوئیں پر چلی گئیں۔ ادھ بلوئے دہی کا اتنا بڑا سا گھڑا   نہ لی اور گھر سے نکل گئیں۔" شاہدہ نے کہا اور زرینہ کے مسکراتے ہوئے لبوں کے ایک خم میں مسکراہٹ کی ادھ کھلی کلی شرما کر رہ گئی۔ شاہدہ باورچی خانے میں چولہے کے سامنے چوکی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سردیوں کی آگ میں بھڑک نہ تھی۔ شعلوں کی تڑپ، آگ کا عکس شاہدہ کے

چہرے پر پڑ رہا تھا اور آنکھوں میں ننھے منے شعلے لہرا رہے تھے ۔ اس کے باوجود
شاہدہ شعلہ جوالا تو نہیں لیکن سردیوں کی اس پرسکون آگ کا دیپک راگ ضرور لگ
رہی تھی اور زرینہ نرم نرم دھوپ میں ننگے سر یوں کھڑی تھی جیسے سورج دیوتا کے
مندر کی دیو داسی ہو ۔ گھنے سیاہ بال کمر تک پہنچ رہے تھے اور ہلکے نیلے رنگ
کی گرم چادر پر بکھر گئے تھے اور اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا جس سے کچے
خوابوں کے نغمے چھلک رہے تھے ۔

"شاہدہ!" زرینہ نے دھیمی آواز میں کہا "تم نے اس چڑیا کا گانا سنا جو منہ اندھیرے
بیری کے ٹنڈ منڈ درخت پر بیٹھ کر گاتی ہے"

"ہاں!"

"کل مجھے بھی جلد جگا لینا ۔ میں اس چڑیا کا راگ سننا چاہتی ہوں ۔ کتنے دکھ
بھرے انداز میں گاتی ہے اور شاہدہ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے پائیں باغ کے کسی
دور کے درخت سے اس کی راگنی کا جواب بھی آتا ہو۔"

"شاید!" شاہدہ نے اس کے رومان پرور جذبات کا ساتھ نہ دیا "میں تو
گاؤں سے تنگ آ چکی ہوں ۔"

"اتنی جلد ابھی تو بھیا بھی نہیں آئے ۔"

"کامل نہ جانے کہاں رہ گیا ہے" شاہدہ نے شرما کر کہا اور اپنی شرماہٹ کو
شعلوں کے دھیمے سے عکس میں چھپانے کی کوشش کرنے لگی ۔

"آ جائیں گے حضور ۔ کیوں نہ آئیں گے بھلا ؟ میری سرکار کچے دھاگے سے بندھ کر آئے
گی ۔ شاہدہ رانی آرام کیلئے شہر کی ساری رونقیں چھوڑ کر اس اجاڑ سے گاؤں میں آ
بسیں اور کامل بھیا ہیں کہ دور پہاڑوں پر برف کے نظارے کر رہے ہیں ۔ انہیں
برفیلی تنہائیوں میں کیا خاک لطف آتا ہوگا" زرینہ کے لہجے میں چمک تھی اور شاہدہ کی

آنکھوں میں شفق کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔

"زرینہ! تم آدھی رات کو کونسا سپنا دیکھتی ہو؟"

"میں......" زرینہ چونک گئی "میں نے رات ہی جو بتا دیا تھا۔"

"تم نے صرف اتنا کہا تھا کہ تم ایک میٹھی سی سُر سُنتی ہو۔"

"ہاں! ایسا لگتا ہے جیسے یہ سُر میری روح میں رَچ جانے کے لئے تتلی کی طرح پھڑ پھڑاتی ہو۔"

"بس اتنا سا سپنا...... تم کھڑکی کیوں کھولتی ہو؟"

"میں ڈرتی ہوں یہ راگنی بند کھڑکی کے ساتھ سر پھوڑ کر نہ مر جائے۔"

"گاؤں میں آ کر ایسے سپنے دیکھنے کی کیا وجہ ہے تم نے کچھ غور کیا زرینہ؟"

"نہیں" زرینہ نے دھیمے لہجے میں کہا "میں نے غور نہیں کیا اور میں سوچنا بھی نہیں چاہتی شاہدہ۔ میں تو چاہتی ہوں یہ دور دیس سے آنے والی سُر میری روح میں رچ جائے تو میں نیلے آکاش سے جا چھوؤں۔"

"میں تیری طرح سنہرے خواب دیکھتی ہوں نہ مجھے شاعری آتی ہے زرینہ۔ پر میں نے سنا ہے پنجاب ہیر رانجھے اور سوہنی مہینوال کا دیس ہے۔ اس دیس میں رانجھے اور مہینوال بانسری بجاتے ہوئے آتے ہیں اور ہیریں اور سوہنیاں راگنی کی لے پر رقص کرتی ہوئی اُن کا استقبال کرتی ہیں۔"

"شاہدہ باجی! اگر کامل بھائی دو چار دن اور پہاڑوں پر رہ جائیں تو پنجاب کی شاعری کو کامل شاہدہ نامی ایک اور قصہ ہاتھ آ جائے۔" زرینہ کی شوخی نے اپنا انتقام لے لیا۔

"یہ آدھی رات کو جو سُر تیری روح میں رس بس جانے کے لئے پر تول رہی ہے کہیں اسی بانسری کا نغمہ نہ ہو۔" شاہدہ کی آنکھیں شرارت سے مسکرائیں۔ اور زرینہ

کِھل کِھلا کر ہنس پڑی جیسے ساون کی ایک گھٹا پھٹ پڑی ہو۔ پھر گھٹا برس کر اچانک کھل گئی تو فضا میں کامل سکون طاری ہو گیا۔ زرینہ باورچی خانے کے اندر آئی اور شاہدہ کے پہلو سے پہلو ملا کر چوکی پر بیٹھ گئی۔ شُوں شُوں چائے کا پانی اُبلنے لگا اور دونوں خواب کے ایک عالم میں کھو گئیں۔

چھوٹے سے سٹیشن کا پلیٹ فارم خالی تھا۔ دونوں بہنیں اپنا اپنا اٹیچی کیس لے کر اُتری ہی تھیں تو گاڑی پھک پھک کرتی چل دی۔ یکایک چچا جمال لپک کر کہیں سے آ گئے۔ "لڑکیو! تم آ گئیں؟" دونوں بہنیں مسکرائیں۔ چچا نے باری باری دونوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور انہیں ساتھ لے کر سٹیشن سے باہر آ گئے۔ انہیں تانگے پر بٹھا کر چچا نے راسیں ہاتھ میں لیں اور کچی سڑک کا سفر شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر درخت تھے اور گندم کی نوخیز کونپلیں دُور دُور تک سبزہ نورستہ کی چادریں بن کر پھیلی تھیں۔ تانگہ اُچھلتا کودتا نالے تک پہنچ گیا۔ نالے پر پُل نہیں تھا اور نالے کے اندر پایاب پانی تھا۔ جب تانگہ نالے کے اندر پہنچا تو کیچڑ میں پھنس کر رہ گیا۔ چچا نے کہا "بھئی! بڑی مصیبت ہوئی۔ دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آ رہا۔"

چچا نے غصّے سے گھوڑے کو دو تین چابک بھی لگائے۔ گھوڑے نے زور مارا لیکن تانگہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ سامنے کے کنارے پر درختوں کا ایک جھنڈ تھا اور ہری ہری دوب کا ہموار فرش اور اس جھنڈ سے بانسری کا ایک نغمہ پھوار کی طرح گرا تو چچا جمال نے پکار کر کہا "اوئے احمد! اِدھر تو آ۔"

"آیا بھائی آیا۔"

سامنے کے ڈھلوان سے ایک درمیانے قد کا گٹھے ہوئے جسم والا نوجوان اُترنے لگا جس کے ہاتھ میں بانسری تھی۔ پانی کے قریب پہنچ کر اُس نے بانسری کو تہمد کی ڈب،

میں اُتر کر لیا اور جوتے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے ۔ تہمد کا لنگوٹ کس کر وہ پانی کے اندر آ گیا ۔ اُس نے زرینہ کی سیٹ کے ساتھ والا پہیہ گھمایا تو چچا نے گھوڑے کو چابک لگایا اور پہیہ ایک دھچکے کے ساتھ کیچڑ میں سے نکل گیا اور تانگہ سامنے کے ڈھلوان پر چڑھتا ہُوا چشم زدن میں ہموار سڑک پر پہنچ گیا ۔ احمد نالے میں کھڑا تھا اور بڑی بے نیازی کے عالم میں تانگے کی طرف دیکھتا رہا ۔ اُس نے ایک نظر زرینہ کو دیکھا لیکن یہ کم نگہی کی ایک اڑتی سی جھلک تھی جو ہموار سڑک تک پہنچتے پہنچتے چند دھچکوں میں یوں گھل مل گئی تھی کہ ایک بھرپور نظر کے قالب میں بھی نہ ڈھل سکی ۔

چچا کہ ایک لمحے کے لئے بھی نہ رُکے کہ احمد کا شکریہ ادا کر لیں ۔ زرینہ کو کچھ افسوس سا ہُوا ۔ تانگہ چند گز آگے بڑھا ہوگا کہ احمد بھی کنارے پر آ کھڑا ہوا ۔ اُس نے بانسری منہ سے لگائی اور نغمے شبنم کے قطروں کی مانند برسنے لگے ۔ ان کے آہنگ میں گھن گرج نہیں تھی ۔ زرینہ کی پیشانی پر اوس کا ٹھنڈا چھینٹا پڑا ۔ تانگہ گاؤں کے گرد چکر کاٹتا ہوا گاؤں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر کوٹھی کے سامنے آکر رُکا تو زرینہ کی آنکھیں خود بخود مُند سی گئیں ۔ اُس نے کامل کا ہیولے دیکھا جس کے ہونٹوں سے بانسری لگی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھوں میں ایک مافوق الفطرت چمک تھی جو بڑے اضطراب کے ساتھ اُس کا استقبال کر رہی تھی ۔ زرینہ کا رواں رواں کانپ گیا ۔

”ایک کا ہیولے دوسرے میں کیوں مدغم ہو گیا تھا؟“ اُس نے سوچا ۔

”لڑکیو اُترو ۔ تمہاری چچی جان کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں ۔ کامل میاں تو سوات کی سیر کو گئے ہیں ۔ آج گھر پہ ہوتے تو کتنا لطف رہتا ۔“

”کامل گاؤں میں نہیں چچا؟“ شاہدہ نے چونک کر پوچھا ۔

”نہیں بیٹی ۔“

"لیکن میں نے انہیں ابھی ابھی پھاٹک پر کھڑے دیکھا!" زرینہ نے شاہدہ کے کان میں دھیمے سے کہا۔

"تمہیں دھوکا ہوا ہوگا زرینہ! پھر تم ہو بھی تو سدا کی پگلی۔ خواب دیکھنے والی شہزادی"۔ شاہدہ نے بڑی بہن کی سی شفقت کے ساتھ زرینہ کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔

دونوں بہنیں بیک وقت گویا نیند سے بیدار ہوئیں۔ ایک دوسری کو پہچان کر حیران ہو گئیں۔ شاہدہ نے چائے دانی میں پتی ڈال کر پانی انڈیل دیا۔ "چائے پیو زرینہ!" شاہدہ نے سوئی سوئی آواز میں کہا اور تازہ مکھن میں تلے ہوئے ٹوسٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ زرینہ نے ایک پیالی چائے بنائی اور ایک دو گھونٹ ہی بھرے تھے کہ چچی آ گئیں۔ اُن کے پیچھے میلے کپڑے پہنے رجّو تھی جس کے سر پر دودھ سے چھلکا ہوا "دلوہہ" تھا۔

"لڑکیو!" چچی نے بڑی باٹ دار آواز میں کہا "گاؤں میں آئی ہو تو خالص دودھ پیو۔ مکھن کھاؤ۔ گرم پانی پی پی کر کیوں اپنا کلیجہ جلا رہی ہو؟ رکھ دے دلوہہ رجّو"۔ چچی نے خود بڑھ کر رجّو کے سر سے دلوہہ اتارا اور گھڑونجی پر رکھ دیا۔

"رجّو بیٹی! ذرا شہر کی ان لڑکیوں کو اپنا چہرہ تو دکھا دو"۔ چچی نے مسکرا کر کہا اور رجّو نے ملگجی چادر سے چہرے کو اور بھی ڈھانپ لیا۔

شاہدہ نے کہا "چچی جان! آپ بھی حد کرتی ہیں۔ پہلے رجّو کا تعارف تو کروا دیا ہوتا ہمسے"۔

"رجّو پچھلے سال سے میرے ہاں کام کرتی ہے۔ دو چار دن ننھیال رہ کر کل شام آئی تھی۔ رجّو! یہ شاہدہ اور زرینہ ہیں۔ شہر سے آئی ہیں کہ گاؤں میں رہ کر

ہوا بدئیں پر جب سے آئی ہیں گھر کی چار دیواری میں بند ہیں ۔"

چچی کے اصرار پر رجّو ایک پیڑھی پر بیٹھ گئی تو زرینہ نے کہا "رجّو! دکھا دو نا چہرہ ہمیں "۔ رجّو اور بھی سکڑ سمٹ گئی ۔ شاہدہ نے چائے کی ایک پیالی بنا کر رجّو کی طرف سرکا دی تو چچی نے کہا "پی لے رجّو! دیکھ لینا زیادہ گرم نہ ہو ۔"

رجّو نے کھدر کی چادر میں لپٹا ہوا ہاتھ باہر نکالا تو شہر کی لڑکیاں حیران رہ گئیں ۔ یہ بھرا بھرا گورا ہاتھ تھا جس کے کھردرے پن میں گدرایا ہوا حسن تھا ۔ لمبی لمبی نازک انگلیوں کی مخروطی پوریں سرخ تھیں اور ناخن برتن مانجھنے، آٹا گوندھنے اور اُپلے تھاپنے کی وجہ سے کچھ بدرنگ سے اور ٹوٹے ٹوٹے سے تھے اور جب رجّو نے شرماتے شرماتے چہرے سے چادر کا پلّو ہٹایا تو شاہدہ اور زرینہ حیرت کے مارے دم بخود رہ گئیں ۔ اتنا صحتمند چہرہ کہ جیسے تازہ تازہ لہو کا غازہ بھرا ہوا ہو اور گال جیسے انار کے پھول اور آنکھیں اگر کنول کے ساغر تھیں تو اُن میں شبنم سے دُھلے ہوئے چنبیلی کے پھولوں کی مہک بھی تھی اور سیاہ پلکیں سرخ سرخ گالوں پر یوں گر رہی تھیں جیسے آگ کے ساتھ کھیل رہی ہوں اور ابھی جل جائیں گی ۔

" لڑکیو! دیکھو دودھ اور مکھن پر پلی ہوئی جوانی کو ۔ میری مانو تو اب یہیں رہ جاؤ دونوں بہنیں ۔ شاہدہ! تم نے بارھویں کا امتحان پاس کر لیا ہے نا؟"

" جی ! چچی جان! اور میں نے بی ۔ اے کے پہلے سال میں داخلہ بھی لے لیا ہے ۔"

" کیا کرو گی اتنا پڑھ کر ۔ یہیں گاؤں ہی میں تو ...." یہ چچی کا بڑا پسندیدہ موضوع تھا ۔

بے چاری شاہدہ نے بات کاٹ کر کہا " چچی جان! اب رجّو روز آیا کرے گی نا ۔"

چائے پی کر شاہدہ اور زرینہ صحن میں آگئیں۔ دو چار لمحے دھوپ میں کھڑے ہو کر دونوں اندر سے کرسیاں اُٹھا لائیں۔ کرسیاں بچھا کر دونوں بیٹھ گئیں تو زرینہ نے کہا "شاہدہ! تم نے رتیجہ کی شکل وصورت میں کوئی شاہت دیکھی"
"نہیں تو۔"
"سوچو.... تاریخ ہندوستان کی کسی دلآویز ہستی سے"
شاہدہ نے کچھ دیر سوچ کر کہا "تمہارا اشارہ نور جہاں کی طرف ہے نا؟"
زرینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تو شاہدہ نے ذرا چڑ کر کہا "بہت دور کی کوڑی لائی ہو۔ کہاں نور جہاں کہاں یہ گنوارن۔"
"نہیں شاہدہ تم انصاف سے کام نہیں لے رہیں" زرینہ کی آنکھوں میں مدھم سی شرارت تھی۔
"تم کیوں مسکرائیں زرینہ" شاہدہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔
"یونہی .... شاید اس لئے کہ تاریخ کی نور جہاں تو گلاب کی پنکھڑی سے بھی نازک تھی اور عطر گلاب کی موجد اور یہ گاؤں کی نور جہاں اُپلے تھاپنے کی ماہر اور اس کے کپڑوں سے کھٹی لسی کی بو باس بھی آتی رہی" زرینہ نے شوخی سے کہا۔
"اتنا مت اتراؤ زرینہ۔ میں نے نور تجہ کو دیکھ کر اتنا احساس کمتری محسوس کیا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے اور میں نے پہلی بار۔"
شاہدہ کچھ اور کہنے ہی والی تھی کہ چچی اندر سے آگئیں۔ شاہدہ اٹھی اور کشیدہ کاری کا سامان لے آئی۔ زرینہ اندر سے ایک کتاب لا کر پڑھنے لگی۔ صحن میں گرم گرم دھوپ کا گہرا سکون چھا گیا تھا۔ پاپئیں باغ کے کسی درخت پر ایک کلدم چہکنے لگا۔ اُس کی چہک میں نوخیز دھوپ کا سیال نغمہ تھا کہ قطرہ قطرہ ہو کر گر رہا تھا جیسے آبشار کا دھیما سا راگ ہو کہ دھوپ اور سایوں میں گم ہو ہو کر اُبھر

رہا ہو۔

اچانک چچی نے کہا "لو آ بھی گئے وہ"۔

"کون ہے" شاہدہ نے پوچھا۔

"تمہارے چچا پر اتنی جلدی ۔۔۔۔۔"

"نہیں چچی جان! یہ تو کامل بھائی ہیں" زرینہ نے کہا۔

شاہدہ کی انگلیوں میں سلائیاں رک گئیں۔ کامل نے اٹیچی کیس فرش پر رکھتے ہوئے کہا "زرینہ تم ۔۔۔۔۔۔ اور شاہدہ ۔۔۔۔۔ آج تو کمال ہو گیا ۔۔۔۔۔ میرے استقبال کے لئے ۔۔۔۔۔ اور میں شرپاتن سنگھ بھی نہیں کہ سوات کی کوئی مونٹ ایورسٹ ہی فتح کر کے لوٹتا۔ میں اتنے بڑے اعزاز کے قابل کہاں تھا"۔

"کامل بھائی! اتنی بھی کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے۔ آپ خاکی سوٹ میں شرپاتن سنگھ تو نہیں البتہ برفانی ریچھ کے شکاری ضرور معلوم ہو رہے ہیں"۔ زرینہ چہکی۔

"شاہدہ!" چچی نے شاہدہ کو محبت بھری نظروں سے تکتے ہوئے کہا "تم نے کوئی بات نہیں کی"۔

"میں ۔۔۔۔۔ چچی جان ۔۔۔۔۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ کامل آئیں گے تو ان کے ایک کندھے سے بندوق لٹک رہی ہو گی اور دوسرے کندھے پر کیمرہ ہو گا۔"

"کیمرہ بڑے ٹرنک میں سٹیشن پر پڑا ہے۔ بندوق میں سا تھ لے کر ہی نہ گیا تھا۔ شاہدہ! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری خواہش کے مطابق پورا نہ اتر سکا"۔ کامل نے ہنس کر کہا۔ زرینہ نے صحن میں ایک اور کرسی بچھا دی۔ چچی باورچی خانے میں چلی گئیں اور سردیوں کا خوشگوار دن چٹکیوں میں بیتنے لگا۔ زرینہ چہک چہک کر باتیں کرتی رہی۔ شاہدہ خاموش رہ کر کنکھیوں سے کامل کو دیکھتی رہی جیسے ان بکھری بکھری جھلکیوں سے اسے اپنے من میں بسا لینا چاہتی ہو۔

زرینہ نے کہا "کامل بھائی! اگر آپ دو چار دن اور نہ آتے تو شاہدہ باجی بیراگن بن کر سوات کی طرف نکل جاتیں"۔

"زرینہ!" شاہدہ نے شرم اور غصّے سے پکار کر کہا۔

کامل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"کامل بھیا! مجھے تو ڈر تھا کہ پنجاب کی شاعری میں ایک اور قصّے کا اضافہ ہو جاتا "قصّہ کامل شاہدہ"۔ زرینہ کی شوخ نگاہوں میں شرارت کی پسی ہوئی بجلیاں تھیں لیکن کامل یکایک بجھ سا گیا۔

شاہدہ حجاب سے پکار کر کہنے لگی "زرینہ جب سے گاؤں آئی ہے۔ آدھی رات کو دریچہ کھول کر ایک راگنی کا سواگت کرتی ہے"۔

"کونسا دریچہ؟" کامل نے چونک کر پوچھا۔

"وہی جو پائیں باغ کی طرف کھلتا ہے"۔

"یہ تو بڑی خطرناک بات ہے زرینہ!" کامل نے جھجک کر کہا "اس دریچے سے ساون کا پہلا جھونکا آتا ہے۔ اس پر ابرِ بہاراں کی نمدار پھوار ہوتی ہے اور انہیں آم اور رجامن کے کومل پتوں سے پہلی بار کوئل کی راگنی جنم لیتی ہے"۔

بات ختم کر کے کامل چپ چاپ اپنے آپ میں کھو گیا۔

"لڑکیو! کھانا تیار ہے۔ کامل کو بہت بھوک لگ رہی ہوگی"۔ چچی نے کہا اور شاہدہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ زرینہ اور کامل اکیلے رہ گئے تو ایک مدت بعد کامل نے کہا "زرینہ! جو کچھ شاہدہ نے کہا سچ ہے؟"

"سچ!" زرینہ نے حیران ہو کر کہا "وہ تو ایک سپنا ہوتا ہے جو آنکھ کھلتے ٹوٹ جاتا ہے"۔

"زرینہ! پائیں باغ کے اس دریچے سے یہ راگنی ضرور در آتی ہے۔ میں نے

تو یہ سپنا اُس وقت دیکھا تھا جب گھٹائیں اُمڈی ہوئی تھیں اور آموں میں ٹپکا لگ رہا تھا اور آدھی رات کو برہا کی ماری ایک کوئل بھی کوک رہی تھی اور سردیوں کی آدھی رات کا یہ سپنا!...... میں حیران ہوں یہ ادھر سی سُرشبنم کی کسی بوند پر تھرتھرائی ہوگی زرینہ"؟

کامل نے زرینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ زرینہ نے کانپ کر آنکھیں جھکا لیں اور دھیمے سے کہا" یہ تو نیند کا ایک مذاق ہے کامل بھائی"۔

" نہیں"! کامل نے بڑے یقین سے کہا۔

" کھانا کھالو کامل"! چچی نے باورچی خانے سے پکار کر کہا۔

کامل بادلِ نخواستہ اُٹھا۔ کھانے کی میز پر بہت کم باتیں ہوئیں۔ تب کامل آرام کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا اور رجّو میز پر سے برتن اکٹھے کرنے لگی۔ برآمدے میں آکر شاہدہ نے زرینہ سے کہا" میں حیران ہوں زرینہ!"

" کس بات پر"؟

" رجّو اس گھر میں پچھلے سال سے کام کر رہی ہے لیکن اس سے میز پر کھانا لگانے کا کام نہیں لیا جاتا"۔

" یہ کون سی حیرت کی بات ہے"۔ زرینہ نے جواب دیا۔

" میں نے چچی سے ذکر کیا تو وہ مسکرا کر کہنے لگیں تمہارے کامل اس بات کو پسند نہیں کرتے۔ اکثر باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھا لیتے ہیں"۔ شاہدہ نے کہا۔

" اچھا ہے۔ کون سا اتنا بڑا کنبہ ہے کہ ہر روز کھانے کا میز لگے۔ یوں بھی تو سادگی میں لطف ہے باجی"۔

" لیکن رجّو اس گھر کی نوکرانی ہے زرینہ"! شاہدہ کے لہجے میں تھوڑی سی تلخی تھی۔

سہ پہر کی چائے پی کر چچی نے باورچی خانے کا کام رجّو کو سونپا اور شاہدہ اور زرینہ کو ساتھ لے کر کنوئیں کی طرف روانہ ہوگئیں کامل تھکا ہوا تھا۔ ساتھ نہ جاسکا۔ جب وہ پھاٹک پر پہنچیں تو چچا بھی تحصیل سے آگئے۔ اُن کے چہرے پر غصہ تھا۔ کہنے لگے "ہو بھئی لڑکیو! تمہیں سردیوں میں گاؤں آنے کی کیا سوجھی؟ گرمیوں کی چھٹیوں میں آتیں تو ساون بھادوں کی جھڑی کا مزا اٹھاتیں۔ کامل میاں آگئے؟"

"آگئے"! زرینہ نے کہا۔

" اچھا ہوا آگئے۔ اس سال بی اے کرلیں تو انہیں مال کے محکمے میں بھرتی کروادوں خواہ پٹواری ہی کیوں نہ لگیں۔"

"نہیں چچا! وہ تو ایم۔ اے میں داخلہ لینا چاہتے ہیں"! زرینہ نے کہا۔

"نہیں جی! بڑے بھیا اتنا پڑھ لکھ کر ارسطو بھی بن گئے تو ہمیں کیا؟ کالج میں پروفیسر ہونے سے تو بہتر تھا کہ محکمۂ مال میں بھرتی ہوتے۔ آج کہیں ڈی سی نہیں تو مال افسر ضرور لگے ہوتے اور خاندان کا وقار......"!

"چلو لڑکیو! شام پڑرہی ہے" چچی نے بات کاٹ کر کہا "آج تمہارے چچا کو تحصیل میں کرسی نہیں ملی ہوگی"!

کنواں گاؤں سے ایک میل دور تھا۔ گندم کی مخملیں وسبزیں دُور اُفق سے جا ملی تھیں۔ پگڈنڈی زرد زرد دھوپ میں چمک چمک کر کُمھلا رہی تھی "لڑکیو! سردیوں کا دن تو یوں چٹکیوں میں گزر جاتا ہے۔ ہم نے دیر کردی" چچی نے کہا۔

"سردیوں کا دن جوں جوں ڈھلتا ہے، طبیعت اداس ہوتی چلی جاتی ہے"

شاہدہ بولی۔

"نہیں تو۔ ابھی ڈوبتے سورج کا نظارہ تو دیکھنا۔ کتنا دلفریب ہوگا" زرینہ نے کہا۔

یکایک ایک طرف سے بانسری کے نغموں کی پھوار آئی تو چچی نے کہا "وہ پاگل سا لڑکا احمدؔ ہے۔ کچھ کام نہیں کرتا۔ سارا دن بانسری منہ سے لگائے رہتا ہے۔ کبھی یہاں۔ کبھی وہاں۔" کماد کے کھیت کی اوٹ سے احمدؔ یوں اچانک سامنے آنکلا جیسے کوئی اسرار ہو۔ اُس نے بانسری منہ سے ہٹا کر چچی کو سلام کیا۔ چچی نے ہنس کر پوچھا "احمدؔ! کیا کر رہے ہو؟"

"یونہیں موج میلہ ماسی!" چچی کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور احمدؔ پگڈنڈی سے ہٹ کر کماد کے کھیت میں کھڑا ہو گیا۔ چچی اس کے پاس سے گزر گئیں۔ اُن کے بعد شاہدہ۔ موج میلہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ جب زرینہؔ پاس سے گزرنے لگی تو اُس نے آہستہ آہستہ سر اُٹھایا اور زرینہ یونہی مسکرا پڑی۔ موج میلہ زرینہؔ کی اس مسکراہٹ میں اُلجھ کر حیران ہو گیا۔ اُس نے زرینہؔ کی آنکھوں میں ڈری ڈری نگاہوں سے جھانک کر دیکھا تو زرینہ جھینپ سی گئی۔ یہ ایک منظر! ...... اور پگڈنڈی کے پیچ و خم میں گہرائیاں اور گیرائیاں پیدا ہو گئیں۔ اُس نے ایک قدم بڑھایا تو موج میلہ کا ہیولے دُھندلا پڑ گیا اور کماد کے کھیت کے متوازی پگڈنڈی کا ایک بل ختم ہوا تو ایک دوسرے موڑ سے کاملؔ بھیا کا سراپا یوں اُبھر آیا جیسے کالی گھٹا میں سے ایک ستارہ نکلے۔ اسی میں آب و تاب تھی۔ زندگی اور گرمی تھی۔ یہ تو ایک حقیقت تھی۔ خواب نہیں تھا۔ اس پر تصوّر کی دھندلاہٹ بھی نہیں تھی حالانکہ کاملؔ بھیا کو ابھی ابھی وہ گھر چھوڑ کر آئی تھی وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی تو یہ ہیولے شام کے دھندلکے میں تحلیل ہو گیا۔ ایک سرد جھونکا آیا اور اُس دوشش پر نغمے کی ایک پھوار اور سردیوں کی اُداس شام نے اُس کے کان میں سرگوشی کی "زرینہؔ! یہ دوسری بار ہے تو نے موج میلہ کی بانسری کی لَے میں سے کاملؔ بھائی کے سراپے کو تخلیق ہوتے دیکھا۔"

"زرینہؔ!" شاہدہ نے دو قدم پیچھے آکر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے کیا

سوچ رہی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں شاہدہ"

اور دور اُفق کی گولائیوں میں درختوں کے پیچھے سورج ڈوب گیا اور شفق پھول کر گل وگلنار بن گئی اور سرسبز کھیتوں پر سنہری سائے لہرانے لگے۔ جب وہ کنوئیں سے لوٹ کر آئیں تو اندھیرا چھا چکا تھا اور گاؤں میں دیوں کی ٹمٹماہٹیں تھیں۔

"خوب سیر رہی زرینہ؟" کامل نے جو برآمدے میں کرسی بچھائے بیٹھا تھا پوچھا۔

"خوب! رستے کے ایک موڑ پر موج میلہ نے بانسری بجا کر ہمارا سواگت کیا۔"

"موج میلہ! وہ تو اس گاؤں کا رانجھا ہے۔ میرا تو لنگوٹیا ہے۔ کہو تو کل اس سے جی بھر کر بانسری سنیں۔"

"نہیں......." زرینہ کی آواز تھرتھرا گئی۔

"نہیں!" کامل نے حیران ہو کر دہرایا۔

اس اثنا میں شاہدہ نے ہر کمرے میں لیمپ روشن کر دئے۔ برآمدے میں روشنی کی کرنیں آئیں تو چچی بولیں "شاہدہ کتنی سگھڑ بیٹی ہے۔ میں تو سدا کی پھوہڑ ہوں۔ شاہدہ اس گھر میں آ گئی تو اس کی کایا پلٹ کر رکھ دے گی۔" کھانے کی میز پر چچا اور چچی کی موجودگی میں کوئی خاص باتیں نہ ہو سکیں۔ ڈرائنگ روم میں دھیمی سی روشنی تھی اور یہاں کامل ایک چشمے کی طرح اُبل پڑا۔ سوات کے نظارے۔ چھوٹے چھوٹے لطیفے۔ ہلکی پھلکی سدا بہار کہانیاں۔ یکایک کامل خاموش ہو گیا۔ جیسے جھرنے کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ ایک لطیفے کو ادھورا چھوڑ کر باورچی خانے میں چلا گیا تو شاہدہ نے اُداس لہجے میں کہا "زرینہ! تمہیں کچھ عجیب سا احساس نہیں ہوتا؟"

"کیا؟"

"کامل کچھ بدل سے گئے ہیں۔"

"نہیں تو......"

"پھر میرا احساس غلط ہے۔" شاہدہ نے کہا اور باورچی خانے سے چچی کی باٹ دار آواز آئی۔

"بیٹا کچھ دنوں سے تیرے خیالات بدل گئے ہیں۔ رجّو اس گھر کی نوکرانی ہے۔ میں اُس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتی ہوں لیکن اُسے گھر کا ایک فرد کیسے سمجھ لوں۔ تم پسند کرو گے کہ تمہارے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھالے۔"

"یقیناً۔" کامل نے بغیر کسی جھجک کے کہا۔

"یہ نیا تجربہ بھی کر لینا پگلے پر پہلے رجّو سے تو پوچھ لینا کہ وہ اس کے لئے تیار بھی ہے یا نہیں۔"

کامل واپس آیا تو اُس کے چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ کی پرچھائیاں تھیں۔

"اماں جان بھی کتنے پرانے خیالات کی عورت ہیں۔ انسان کو انسان نہیں سمجھتیں۔ کھانا کھالینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ بیچاری رجو کے سر پر رکھ کر اُسے چلتا کرتی ہیں۔"

"رجّو!" شاہدہ کے ہونٹ مسکرانے کی کوشش میں کانپ کر رہ گئے اور وہ ہونٹ بھینچ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"کامل بھیا! جب شاہدہ باجی نے پہلی بار رجّو کو دیکھا تھا تو اُن کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔"

"سچ؟" کامل نے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا۔

"کامل بھائی! کبھی آپ نے غور کیا رجّو کی شکل و صورت میں ایک خاص مشابہت ہے"

"نہیں تو......"

"تاریخ ہندوستان کی ایک نہایت دلفریب ہستی ہے جس کا ایک ہاتھ گھوڑا اچھالتا رہا اور دوسرا ہاتھ حکومت کی باگ پر رہا"۔

کامل کافی دیر سوچتا رہا۔ تب اُس کی آنکھیں صبح کے ستارے کی مانند چمک کر روشن ہوگئیں۔ اُس نے وفورِ جذبات کے ساتھ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "زرینہ! یہ الہام تمہیں کیسے ہوا؟"

"مجھے!" زرینہ نے حیرت بھری نگاہوں سے پوچھا۔

"یہ تو میرے تخیل کی ادھوری سی تشبیہہ تھی تمہیں اتنے عظیم الفاظ کہاں سے مل گئے؟ زرینہ! تو نے اتنا اونچا راز کیسے پالیا؟ میری روح مدت سے اس کی تلاش میں سرگرداں تھی"۔ کامل نے تیز تیز کہا۔ اس کے لہجے میں بڑی گھمبیرتا تھی۔

"کامل بھائی"! زرینہ نے عام لہجے میں کہا "آپ تو بہت اونچے اڑ گئے۔ میں نے تو بڑی معمولی سی بات کی تھی۔ زمین کی بات"!

رات بہت لمبی تھی!

شاہدہ حسبِ معمول صبح سویرے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے بائیں باغ والی کھڑکی کھول دی۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک بھیگا جھونکا آیا تو زرینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ ابھی کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ کروٹ بدل کر پھر سو گئی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے صبح کی سرخیاں جھلک رہی تھیں۔ وہ چادر اوڑھ کر برآمدے میں آئی تو کامل اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

"زرینہ! آج رات تو نے وہ سپنا دیکھا"؟

کامل کے اس اچانک سوال پر زرینہ کا تن بدن تھرا سا گیا۔

"میں نے کوئی سپنا نہیں دیکھا کامل بھائی"!

"سچ کہہ رہی ہو زرینہ ؟"

"آپ کو یقین نہیں رہا کامل بھائی"۔ زرینہ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"یہ شمر یہ راگنی تو کسی بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے"۔

"ہو گی ــــ لیکن میں نے تو کسی طوفان کو سر اُٹھاتے نہیں دیکھا"۔

"یہ راگنی جب پہلی بار میری روح سے ہم کلام ہوئی تھی تو میں نے محسوس کیا تھا کہ آج میری زندگی کا پہلا دن شروع ہوا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ میرے رویئیں رویئیں میں رچ گئی۔ اب یہ ایک گہرا دکھ بن گئی ہے۔ میں اس سے بھاگتا ہوں۔ یہ دامن پکڑ کر میرے پیچھے بھاگتی ہے گویا یہ میرا سایہ ہو۔ میں اس سائے سے نجات حاصل نہیں کر سکتا زرینہ"۔

"میں ابھی اس منزل پر نہیں پہنچی"۔ زرینہ نے کامل کو مذاق میں ٹال دینے کی کوشش کی۔

"زرینہ! تم مجھے سمجھ سکتی ہو۔ میرا اور تمہارا درد ایک ہے"۔

زرینہ کے جسم کو ایک یخ بستہ لہر چھو کر گزر گئی۔ اُس نے کپکپا کر کہا "میں نہیں سمجھ سکتی کامل بھائی ؟"

"نہیں زرینہ! میں تم سے التجا کرتا ہوں مجھے ضرور سمجھنے کی کوشش کرو"۔ کامل نے بڑے خلوص سے کہا اور زرینہ کی آنکھوں میں خوف کی ایک جھلک پیدا ہو گئی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں کامل بھائی ؟"

"زرینہ! میں آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہوں۔ اگر تم نے میرے دل کا راز نہ سنا تو......"

زرینہ نے باورچی خانے کی طرف قدم بڑھا لیے۔

"کامل بھائی! شہلا باجی چائے تیار کر چکی ہوگی۔ آئیے ناشتہ کیجئے۔" زرینہ نے کہا۔
اور اتنا کہہ کر بھاگ کھڑی ہوئی جیسے ابھی آتش فشاں پھٹ جائے گا۔ زمین کانپنے لگی۔ آسمان روئی کی طرح دھنکا جائیگا اور ستاروں کی دھول اُڑ کر ساری دنیا پر چھا جائے گی۔

ناشتے کے بعد کامل انہیں ساتھ لے کر گاؤں کے ارد گرد گھومتا رہا۔ یہ دن بڑا خوشگوار تھا۔ نرم گرم دھوپ کسی شاعر کے احساس کی طرح لطیف اور زندہ تھی۔ نالے کے کنارے۔ پائیں باغ میں۔ کنوئیں پر۔ کامل ہر جگہ اُن کی تصویریں لیتا رہا۔ نالے کے کنارے ایک ٹیلے پر اُن کی موتج میلے سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ کامل موتج میلے کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے پیش آیا۔ کامل نے موتج میلے سے بانسری پر چند دھنیں سُنانے کی فرمائش کی۔ زرینہ خوف زدہ ہو کر شاہدہ کے پیچھے چھپ گئی۔ موتج میلے نے ہنس کر کامل کو ٹال دیا۔ کامل اصرار کرتا رہا اور زرینہ کا دل دھڑکتا رہا جیسے موتج میلہ نے بانسری منہ سے لگائی تو آتش فشاں کا دہانہ پھٹ پڑے گا اور وہ گھٹنوں کے بل گر کر کامل بھائی کی پوجا کرنے لگ پڑے گی لیکن موتج میلہ مسکراہٹ کی آڑ میں انکار کرتا رہا۔ کامل ناگواری کا احساس لئے ہوئے انہیں ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر زرینہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بستر پر بیٹھ کر وہ ایک کتاب پڑھنے لگی۔ پھر اُس کی آنکھ لگ گئی۔ نیند میں شفاف دھوپ کا سا سماں تھا لیکن اس کے باوجود زرینہ کے خواب الجھے ہوئے تھے۔ کچھ واضح نہیں تھا جیسے خوابوں کی وادی میں سنہری دھند چھائی ہوئی ہو۔

شاہدہ نے اُس کا کندھا ہلا کر کہا "چائے نہیں پیو گی زرینہ؟"

"نہیں بہیج دو رجو کے ہاتھ باجی!" زرینہ سوئی سوئی آواز میں بولی۔

"رجّو!" شاہدہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا" چچی اُسے سامنے کے کرب کی لپٹیں پر سجا چکی ہیں۔"

"تو چلو میں تمہارے ساتھ باورچی خانے میں چلتی ہوں"۔ زرّینہ اُچک کر بستر میں سے نکلی۔

صحن میں زرد اُداس سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

"زرّینہ! نجانے اس دفعہ گاؤں میں میرا جی کیوں نہیں لگا؟ کیوں نہ کل ہم لوٹ چلیں"۔

"کامل بھائی کیا کہیں گے؟"

"وہ ہمیں نہیں روکیں گے۔ تم نے دیکھا نہیں وہ کچھ بدل سے گئے ہیں؟"

"نہیں تو......" زرّینہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

"زرّینہ! جب چچی کتوئیں پر جانے لگیں تو کامل صحن میں بیٹھے تھے۔ چچی کے جاتے ہی وہ بھی باہر نکل گئے"۔

زرینہ کو اپنی روح میں ایک عجیب سے کھوکھلے پن کا احساس ہوا لیکن اُس نے مسکرا کر کہا۔

"شاہدہ باجی! محبت کے سفر میں ایسی منزلیں بھی آیا کرتی ہیں۔ کبھی اندھیرے کبھی اُجالے"۔

شاہدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی اُداس آنکھوں میں مسکراہٹ تھی اور دھیرے دھیرے یہ مسکراہٹ آنسوؤں میں بھیگ گئی تو زرّینہ شاہدہ سے لپٹ گئی"۔ میری پگلی باجی!" اور شاہدہ سے لپٹتے لپٹتے ماحول پر خوابوں کے دھندلکے چھاگئے۔ ایک دھواں سا بکھر گیا اور اس کے ایک مرغولے سے کامل بھیا کا سراپا دھیرے دھیرے تشکیل پانے لگا تو زرینہ نے کانپ کر شاہدہ کو چھوڑ دیا۔ اُس نے سوچا" مجھے کیا ہو گیا ہے میں کامل بھائی کو کس روپ میں دیکھنے لگ پڑی ہوں۔ شاہدہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہیں یہاں

سے پہلے چلے جانا چاہئے"۔

دھیرے دھیرے ایک اور دن بیت گیا۔

ایک اور رات آگئی۔ آج اُسے بہت دیر کے بعد نیند آئی اور نیند کی دیوی نے ابھی جادو کا آنچل پھیلایا بھی نہ تھا کہ روح کے دریچے پر اُسی دھیمی سی سُر نے دستک دی۔ اُس نے لپک کر سرہانے کی کھڑکی کھول دی۔ پائیں باغ میں خوابوں کا گہرا سکون تھا۔ تب اندھیرے میں ایک سرسراہٹ ہوئی اور دور سے ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ بانسری کا ایک نرم خرام نغمہ بھیگ کر اندر آیا۔ اُس نے کھڑکی بند کر دی اور تکیئے پر سر رکھ دیا۔ تکیئے کا ٹھنڈا لمس نیند کا گہرا خمار بن گیا۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کامل اُس کے بستر کے ساتھ ساکت وصامت کھڑے تھے۔ شاہدہ باجی کا بستر خالی تھا۔

ابھی کامل کے ہونٹ کھلے بھی نہ تھے کہ زرینہ نے کہا۔

"کامل بھائی! آج رات اُس راگنی نے پھر میرے خواب محل کے دریچے پر دستک دی"۔

"سچ!" کامل کے لہجے میں مسرت کی کھنک تھی۔

"ہاں......نہیں......" زرینہ تذبذب میں پڑ گئی "یہ تو ایک پریشان خواب تھا"۔

"میں نے بھی پہلے اسے پریشان سپنا سمجھا تھا پر جب میں نے اس کی تعبیر دیکھی تو میری دنیا لرز اٹھی"۔

"تعبیر!......کون سی تعبیر؟......" زرینہ نے نڈھال سی آواز میں پوچھا۔

"یہ تعبیر ایک خوفناک حقیقت بن کر آئی زرینہ! میں نے صدیوں کی روایات کے

محلوں کو دھڑام سے گرتے ہوئے دیکھا - اب میں آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہوں ۔"

"میں نہیں سمجھی ۔"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو زرینہ ! میں صاف صاف کیوں نہ کہہ دوں ۔"

"نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

"زرینہ ! میرے خواب کی تعبیر رنجو ہے ۔"

"رنجو !" زرینہ نے کانپ کر کہا ۔

"یہ وہی راگنی ہے جو میری روح کے دریچے پر دستک دیتی تھی - اب وہ میری روح میں رچ گئی ہے ۔"

زرینہ کے ہونٹ خشک ہو گئے - اُس کی موٹی موٹی آنکھیں حیرت سے لبریز کنول بن گئیں ۔

"میں نے راز افشا کر دیا ہے - میرے دل سے بوجھ اتر گیا ہے - زرینہ ! مجھے اُمید ہے تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو گی - میرا اور تمہارا درد ایک ہے - مجھے شاہدہ کے جذبات کا بڑا احساس ہے - میں جانتا ہوں دل کا نازک آبگینہ ٹوٹ جائے تو دنیا کی ساری مدھر راگنیاں اپنی موت آپ مرجاتی ہیں لیکن ان کی راکھ سے ایک نیا نغمہ بھی جنم لیتا ہے ۔"

کامل اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا ۔

زرینہ بُت بنے بستر پر بیٹھی رہی - کمرے کی فضا سرد اور منجمد سی تھی - نجانے کہاں سے ایک شعلہ لپکا - زرینہ نے شرارے اور انگارے اڑتے ہوئے دیکھے - دو شرارے اُس کی آنکھوں میں آگرے تو وہ دہکتے ہوئے سورج بن گئیں - اُس کا چہرہ تمتمایا اور کنپٹیوں میں دھماکے سے اُٹھے ۔

کامل نے کمرے سے نکلنے کے لئے قدم بڑھایا تو زرینہ نے تھرتھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کامل بھائی! خواب دیکھنے کے بعد آج رات میں اچانک جاگ اٹھی تو میں نے کھڑکی کھول دی۔ پھر میں نے جاگتے میں ایک اور سپنا دیکھا۔ میں نے بھیگے ہوئے جھونکے پر بانسری کا ایک نغمہ سنا۔"

"بانسری کا نغمہ!" کامل چونک اٹھا۔

"بانسری کا نغمہ جو دور بہت دور سے آرہا تھا۔ اس میں کسی کے دل کا درد بھی تھا۔"

"آدھی رات کو بانسری پر کس نے نغمہ محبت گایا؟"

"میں نہیں جانتی۔ یہ نغمہ ہوا کے دوش پر آیا تھا۔ دیکھئے کامل بھائی! میں نے اپنا راز کہہ دیا۔ میرا اور آپ کا درد ایک ہے۔ آپ اور صرف آپ مجھے سمجھ سکتے ہیں۔"

"نہیں ۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔" کامل نے لکنت کے سے انداز میں کہا۔

"دیکھئے کامل بھائی! زرینہ نے اس کا دامن پکڑ کر کہا "مجھے سمجھئے؟"

"میں نہیں سمجھنا چاہتا۔ تم روایات سے باغی ہو۔ آج تک ہمارے خاندان کی کسی لڑکی نے اس قسم کا نغمہ نہیں سنا۔ یہ کون تھا جس نے تجھے بانسری پر پکارنے کی جرأت کی؟" کامل نے غصے سے لرز کر پوچھا۔

"نجانے کون! یہ آپ کے گاؤں میں اتنی مدھر بانسری کون بجاتا ہے کامل بھائی؟"

"وہ پگلا ۔۔۔۔۔ وہ سورج میلا ۔۔۔۔" کامل الجھ کر رہ گیا۔

"کون جانے ۔۔۔۔ شاید ۔۔۔۔ میرے خوابوں کی تعبیر ۔۔۔۔"

"زرینہ!" غصے کے مارے کامل کی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ "ہمارے

خاندان میں ......''

اور کامل جملے کو نامکمل چھوڑ کر شاہدہ کی چارپائی پر گر گیا۔ زرینہ مسکرائی۔ یک لخت اُس کی آنکھیں جھکیں۔ دوسرے لمحے کمرے کے ماحول پر دھند سی چھا گئی۔ کامل کا سراپا اُس میں تحلیل ہو گیا۔ دھند کے غبار سے ایک نئے ... کامل کا ہیولے دھیرے دھیرے تخلیق کی سب منزلیں طے کر گیا۔ کامل کے ہونٹوں پر بانسری تھی اور اس سے نغمے ٹپک رہے تھے۔ ٹپ ٹپ جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگ رہی ہو۔ یہ نغمات مسلسل ..... یہ راگنیوں کا جلوس ...... اور زرینہ کا دکھ نغموں کو تال دے رہا تھا.....

''کیوں؟ زرینہ! کوئی خواب دیکھ رہی ہو؟''

زرینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس کے سامنے شاہدہ کھڑی تھی۔ اُس کے انگ انگ سے بہار کے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ کامل کمرے میں موجود نہ تھا۔

''نہیں تو شاہدہ!'' زرینہ دھیمے سے بولی۔

''کیوں شاہدہ؟ یہ کیا مذاق ہے؟ امی جان کہہ رہی ہیں تم گاؤں سے جانے کے لئے پر تول رہی ہو۔ ابھی تو چھٹیاں باقی ہیں۔ میں ابھی نہیں جانے دوں گا۔'' کامل برآمدے میں سے چہکے۔

زرینہ نے شال اوڑھی اور کمرے سے باہر نکلنے کے لئے بڑھی تو کامل بھائی چپکے سے اندر آ گئے اور اُس سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھ گئے۔ زرینہ ایک لمحے کے لئے رُک گئی اور سپنوں کا دریچہ کھٹ سے بند ہو گیا۔

بیچی نے باورچی خانے سے پکار کر کہا ''لڑکیو! پانی اُبل رہا ہے۔ آ کر چائے تیار کر لو۔''

شاہدہ اندر سے بولی ''جاؤ زرینہ پتی ڈال آؤ چائے دانی میں اور رجّو سے کہنا وہ چائے کے لئے میز لگائے۔ آخر وہ اس گھر کی نوکرانی ہے۔ اُسے کچھ

تو سلیقہ آنا چاہئے"۔

زرینہ مسکرائی۔ بڑی پُراسرار لطیف سی مسکراہٹ۔ سرما کے ڈوبتے ہوئے سورج کی ایک کرن جو سیاہ ابر پارے کی گرفت سے نکلنے کی کشمکش میں مصروف ہو!

رام کی لیلا

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اِس افسانے کا پہلا حصہ میں نے تقسیمِ ہندوستان سے پہلے لکھا تھا! اور یہ افسانہ میں نے اپنے دوست کیول کرشن کی آپ بیتی سُن کر لکھا تھا۔

اُس زمانے میں مَیں کم از کم آج سے زیادہ اچھا افسانہ نگار تھا کیونکہ اُس زمانے میں مَیں جوان تھا اور کیول کرشن کی آپ بیتی میں جذبات کی آگ تھی اور یہ آگ میرے افسانے میں شعلوں کی چمک بن کر زندہ و تابندہ ہو گئی تھی۔ افسانے کا انجام بڑا ڈرامائی تھا۔ میں نے انجام پر لفظوں کی چِتا جلائی تھی اور اُس پر لیلا کا جسم تھا جس میں کُندن کی دمک تھی اور اس کے بعد کہانی کے آخری موڑ پر صرف چند فقروں کی ضرورت تھی کہ یہ افسانہ ادھورا رہ گیا۔ یہاں پہنچ کر میں افسانے کو اتنا پُر اثر بنانا چاہتا تھا کہ اگر کیول اُس وقت خودکشی نہ کر لیتا (خودکشی کا مجھے پورا پورا یقین تھا) تو میں اُسے یہ افسانہ پڑھ کر سناتا اور ہم دونوں اس کے انجام پر خوب خوب آنسو بہاتے۔

پھر بھی یہ خیال تھا کہ اگر خدانخواستہ کیول کرشن نے بزدلی سے کام لیا اور نوبت خودکشی تک نہ پہنچی تو میں چتا کی چٹختی ہوئی لکڑیوں اور اُڑتے ہوئے شراروں کے درمیان کیول کرشن کو یوں بے حس دکھاؤں گا جیسے وہ بُت ہو اور راگنی میں نہا

کر امر ہو چکا تو۔ بعد ازاں ہم دونوں اس افسانے کی فلم بناتے۔ میں ہیرو لکھتا اور کیول ہیرو کا پارٹ ادا کرتا لیکن میری حسرت پوری نہ ہوئی کیونکہ لیلا لفظوں کی پجاری پرستی نہ ہوئی اور میں نے ادھورے افسانے کو پھاڑ کر نذرِ آتش کر دیا!

اِس ادھورے افسانے کے جلے ہوئے پرزوں کی راکھ تقریباً بارہ سال سے میرے افسانوی ماحول میں اُڑ رہی تھی! مجھے چاہیئے تھا کہ اس چٹکی بھر راکھ کو آج سے بارہ سال پہلے لفظوں کے منتر میں محفوظ کر لیتا لیکن میں ایسا نہ کر سکا حالانکہ تقسیم سے ایک سال بعد یہ افسانہ پھر مکمل ہو گیا تھا لیکن اس کی اچانک تکمیل پر میں حیران بھی تھا اور بے بس بھی۔ بلکہ ایک حد تک بے حس۔ یہ بے حس حیرت آج بارہ سال بعد لفظوں کے آہنگ میں ڈھل سکی ہے۔

بہتر ہے کہ میں اب بڑے سیدھے سادھے انداز میں کہانی کہہ دوں۔

تو سنئے۔

کیول کرشن سناتن دھرم کالج لاہور کا ایک طالب علم تھا۔ اُس کے پتا جی میرے ہم پیشہ تھے۔ وہ اردو اور فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ میں ایک غیر تربیت یافتہ مدرس تھا اور بی۔ اے کی تیاری کر رہا تھا۔ خالی وقت میں کوئی نہ کوئی کتاب لے کر سکول کمپاونڈ کے کسی تنہا کونے میں جا بیٹھتا۔

کیول کے پتا جی نے ایک دن پوچھا "کاکا! جب تجھے خالی وقت ملتا ہے کوئی نہ کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتے ہو؟"

"لالہ جی! میں بی۔ اے کا پرائیویٹ امتحان دے رہا ہوں"

"واہ جی واہ! لوگ کالج میں رہ کر بی۔ اے پاس نہیں کر سکتے اور کاکا! تو اس دور افتادہ قصبے میں جہاں لکھنے کے لئے کاغذ اور پنسل تک نہیں ملتے کیسے بی۔ اے

پاس کر لے گا؟"

"لالہ جی! کوشش تو فرض ہے۔ اگر خدا نے چاہا......"

"رام بھلی کرے! میں ساری تنخواہ کیول کو بھیج دیتا ہوں۔ پھر بھی سمجھتا ہوں کہ اس سال اُس نے بی۔اے پاس کر لیا تو لاکھوں پائے!"

"لالہ جی! بے کار بیٹھنے سے بہتر ہے کہ انسان کچھ نہ کچھ کرتا رہے۔"

"ٹھیک ہے پر کاکا جی! کالج میں پڑھے بغیر......"

میں نے مایوس ہو کر کتاب بند کر دی تو لالہ جی کچھ سوچنے لگے......... دیر بعد انہوں نے کہا "ہاں یاد آیا۔ کیول کو گرمیوں کی چھٹیاں ہیں۔ تجھے اس سے کچھ مدد مل سکتی ہے کاکا؟"

"کیوں نہیں لالہ جی!" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"تو آج چھٹی کے بعد میرے ساتھ گھر چلو۔ تجھے کیول سے ملا دوں۔"

چھٹی کی گھنٹی بجی تو لالہ جی خود مجھے لینے کے لئے میری جماعت میں آ گئے۔ لالہ جی کا گھر پرانی طرز کا خاص ہندوانہ مکان تھا۔ چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اور تنگ اندھیری سیڑھیاں کیول کرشن کا کمرہ اوپر کی منزل میں تھا۔ لالہ جی مجھے لے کر سیدھے کیول کے کمرے میں جا پہنچے۔ "کاکا!" انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

"پتا جی!" کیول نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔

"میں تیرے ایک متر کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔" کیول کرشن نے شاید یہ سمجھا کہ لاہور سے اُس کا کوئی دوست اُس سے ملنے کے لئے آیا ہے۔ اُس نے مجھے بڑی پُر اشتیاق نگاہوں سے دیکھا۔ پھر وہ ایک نیا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا تو لالہ جی نے مونچھوں میں ہنس کر کہا "کاکا! انہیں اپنا متر سمجھ آج سے......... یہ بی۔اے کی پرائیویٹ تیاری کر رہے ہیں۔ انہیں کچھ مدد کی ضرورت ہے۔" اور لالہ جی اتنا کہہ کر

نیچے اُتر گئے ۔ میں اور کیول ایک دوسرے کا سامنا کئے چند لمحے بے حس و حرکت کھڑے رہے ۔ کیول نے کہا ''آپ تشریف رکھئے''۔

میں ایک کرسی پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے اڈے پر گلدم!

کیول کو ایک نظر دیکھ کر مرعوب ہو کر رہ گیا تھا ۔ اُس زمانے میں مَیں نے ایک دھارمک فلم دیکھی تھی اور اُس لمحے میں نے دھارمک فلم کے ایک کردار کو جس نے سری رام چندر جی کا پارٹ ادا کیا تھا اپنے سامنے مجسّم ہوتے دیکھا ۔ وہی آرین نسل کا خالص ہندوانہ چہرہ جس کی ناک ستواں تھی اور بال سنہری اور لچھے دار تھے ۔ آنکھوں میں کنول کے کٹورے چھلک رہے تھے ۔ دھوتی کا ایک پلّو کندھے پر تھا اور پاؤں میں چپل تھے جن میں صرف انگوٹھے اُڑسے ہوئے تھے اور گلے میں بند گریبان کا نکما لگا کرتہ تھا ۔ میں کئی لمحے کیول کو بِٹ بِٹ تکتا رہا ۔ کیول نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں تو میں خود بخود شرمندہ ہو گیا ...... کیول نے میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر کہا ''لالہ جی نے آپ کا پورا پورا تعارف بھی تو نہیں کروایا''۔

''جی! میں لالہ جی کے سکول کا ان ٹرینڈ ٹیچر ہوں ۔ میرا نام کچھ بہت زیادہ بھاری بھرکم ہے ۔ آپ مجھے نقوی کہہ کر پکار لیا کریں''۔

''پتا جی نے مجھے ایک عجیب الجھن میں پھنسا دیا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا سپوت کالج میں پڑھ کر ودھیا ساگر بن چکا ہے''۔ کیول کے ہونٹوں کے کونے میں ایک دبی سی مسکراہٹ تھی۔ ''پھر میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں؟ ......''۔ اور کیول اپنی بات مکمل نہ کر سکا ۔ سیڑھیوں پر لالہ جی کھڑے تھے اُن کے ہاتھ میں پیتل کی چمکتی ہوئی ایک تھالی تھی جو انہوں نے اندر آکر تپائی پر رکھ دی ۔ ہم دونوں احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا ''و کاکا! بیٹھ جاؤ''۔ پھر تھالی سے برفی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر انہوں نے ہماری طرف بڑھا دیا اور کہا ''و کیول بیٹا! ایک ایک ڈلی میرے ہاتھ سے کھالو ۔ میرا جی کہتا ہے کہ تم ایک دوسرے کے

مُتر بن چکے ہو۔"

"جی ! پتا جی"! اور لالہ جی بڑے خوش ہوئے ۔ اُن کی مونچھیں بڑے خلوص سے مسکرائیں اور شدت جذبات سے میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

لالہ جی چلے گئے تو کیول نے کہا "نقوی جی ! میں کالج کا کھلنڈرا لڑکا ہوں ۔ میں نے آج تک ایک نوٹ نہیں لیا ۔ کتابوں کا ڈھیر سامنے الماری میں پڑا ہے ۔ آپ جو کتاب چاہیں لے جائیں ۔ اگر آپ نے کچھ نوٹس تیار کئے ہوں تو مجھے بھی دکھا دیں ۔ مجھے پتہ ہے کہ پرائیویٹ امتحان دینے والے لوگ بہت محنتی ہوتے ہیں اور آپ نے جو کچھ پڑھا ہوگا ، اُس کے نوٹس بھی ضرور لئے ہوں گے۔"

"جی ہاں ! پر وہ کس کام کے ۔ میں کل آپ کو کچھ نوٹس دکھاؤں گا ضرور"۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ برفی ! یہ ماتا جی نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔"

میں نے جھجکتے جھجکتے ایک ڈلی اٹھائی تو کیول نے کہا "نقوی جی ! آپ بلا تکلف کھائیں ...... میں کسی دن آپ کے ہاں حاضر ہوکر جو کچھ آپ دیں گے ، خوب ڈٹ کر کھاؤں گا"۔ میں ایک ڈلی کو توڑتا تو اُس کا باقی حصہ کیول لے لیتا اور کیول کی توڑی ہوئی ڈلی کا بچا ہوا ٹکڑا میں کھا لیتا ۔ برفی ختم ہونے پر میں نے اپنے سینے کو اتنا بھرا ہوا پایا جیسے میں نے برفی نہیں کھائی تھی ، ایک انمول جذبے کی سچی خوشیوں کو سینے میں بھر لیا تھا !

میں نے کتابوں کے ڈھیر میں سے ایک ایکٹ کے ڈراموں کی کتاب اٹھائی اور کیول سے ہاتھ ملا کر کھٹ کھٹ سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا ۔ نیچے لالہ جی کھڑے تھے ۔ انہوں نے کہا "آپ نے کیول کو کیسا پایا ؟"

"کیول بڑے اچھے آدمی ہیں ۔ اُن کے من میں پریم کا اتھاہ ساگر ہے۔"

لالہ جی فرطِ مسرت سے جھوم گئے۔

"پھر کاکا! اس گھر کو اپنا گھر سمجھ۔ جب جی چاہے آ۔"

چند دنوں کے میل جول کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں مدتوں سے کیول کا انتظار کر رہا تھا اور زندگی کے ایک موڑ پر انتظار کی منزل یکدم طے ہو گئی تھی اور تکلف کی آخری دیوار بھی خود بخود گر پڑی تھی ۔ کیول بڑا پُرخلوص دوست ثابت ہوا ۔ ہندو ہونے کے باوجود وہ چھوت چھات کا قائل نہ تھا ۔ ایک وسیع القلب انسان کی طرح وہ بانیٔ اسلام صلعم کا نام بڑے ادب سے لیتا کہ انسانیت کو ایسے عظیم انسانوں ہی سے رفعت نصیب ہوتی ہے ۔ فلسفہ اُس کا پسندیدہ مضمون تھا اور اُسے فلسفہ آرائی کا شوق بھی تھا لیکن وہ فلسفیانہ یبوست سے گریز کرتا ۔ اُس کی مجلس میں وقت پَر لگا کر اڑتا اور اس کی اڑان اتنی سبک اور لطیف تھی کہ مجھے اس کے گذرنے کا احساس بھی نہ ہوتا ۔ چھوٹے سے قصبے کی تنگ داماں زندگی میں کیول تموّج اور وسعت کی ایک لہر بن کر آیا اور میں نے زندگی کو بے انتہا حسین بنتے دیکھا۔

ہم دونوں دن کا اکثر وقت اکٹھے گزارتے اور شام کو لمبی لمبی سیریں کرتے ۔ ساون کی گھٹائیں جھوم کر آتیں اور کوئل کوکتی تو کیول گھر کے اندر بند ہو کر نہ بیٹھ سکتا ۔ قصبے سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی نہر بہتی تھی اور اس کے کنارے آموں اور جامنوں کا ایک باغ تھا ۔ ہم اس باغ میں اکثر جاتے اور کئی بار بھیگ کر واپس آتے اور برسات کی ان رومان پرور ساعتوں میں سے ایک ساعت کچھ زیادہ کبیت نما ثابت ہوئی ۔ ہری ہری دوب پر آم کا گھنا سایہ تھا اور سایہ بھیگا ہوا تھا ۔ آم پک چکے تھے اور ٹپکا لگ چکا تھا ۔ ایک گھنے درخت میں چھپی ہوئی کوئل بھی کبھی کبھار کوئی تان اڑا لیتی تھی ۔ اُس سے کیول کی آنکھوں میں ایک سرمدی کیف اچانک بھر گیا ۔ اُس

نے نیم وا آنکھوں سے خلا میں دیکھ کر کہا "نقوی جی! یہ زندگی گرگٹ کی طرح رنگ کیوں بدلتی ہے؟"

"اسی کا نام تو زندگی ہے کیول صاحب!"

"ابھی دوپہر کو لو چل رہی تھی۔ پھر ہوا بند ہوئی۔ امس اور گھٹن میں سانس لینا دوبھر ہو گیا اور اب زندگی پھر چونک کر یوں جاگ اٹھی ہے کہ ہر سانس امرت کا گھونٹ لگتا ہے۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا تو کیول کوئل کی ایک تان محو ہو گیا۔ تان ٹوٹی تو اس نے کہا "کہتے ہیں چکور کا پیتم چاند ہے۔ بلبل کو پھول سے پیار ہے۔ پپیہا بادلوں میں اڑ کر اپنے پی کو پکارتا ہے پر کوئل کی کوک کس کے لئے ہے؟"

"نجانے!" میں نے سوچے بغیر کہہ دیا۔

"میں بھی تو اس کی پریت کا بھید نہیں پا سکا۔ پر اس کی آواز میں کتنی چھبن ہے۔ ایک دکھ ہے کہ ملہار راگ بن کر چار کھونٹ بکھر جاتا ہے!"

"جی!"

"ان دیکھے ساجن کے ساتھ پریت کی لو لگا کر بھی جیتے رہنا پگلی کوئل ہی کا کام ہے!"

"کوی مہاراج!" میں نے یکا یک چمک کر کہا "پہلے میرا خیال تھا آپ صرف فلسفی ہیں۔ اب معلوم ہوا آپ کویتا بھی کرتے ہیں!"

جواب میں کیول کرشن نے بڑے دھیمے انداز میں مسکرا کر کہا "کالج میگزین کے ہندی حصے میں کبھی کبھار میرے دوہے چھپتے رہیں!"

"واہ جی واہ! پھر تو مزہ رہے گا۔ پر کوی مہاراج کبھی محبت بھی کی یا کوئل کی طرح ان دیکھے ساجن کی پیت ہی کا دم بھرتے رہے؟"

کیول کی آنکھوں کے کنول ایک غیر مرئی جذبے کے زیر اثر چمک اٹھے۔ اس نے

دھیمے سے کہا "کیوں نہیں؟ پریم کے بنا تو جیون ادھورا رہتا ہے۔"

"سچ؟" میں نے ذرا شوخ ہو کر پوچھا۔

"نقوی جی! آپ اسے مذاق نہ سمجھیں۔ پریم تو ان دیکھے ساجن ہی سے ہوتا ہے۔ پر سپنوں کا یہ ساجن اصل کا روپ دھار لے تو پریم کی دوسری منزل شروع ہو جاتی ہے۔"

"تو آپ اس دوسری منزل پر پہنچ چکی ہیں؟"

"ہاں جی!" کیول نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "میرا تو انگ انگ اس اتھاہ ساگر میں ڈوب چکا ہے۔"

اور یکایک بادل کا ایک ٹکڑا ایک کر سورج پر چھا گیا۔ آم کا گھنا سایہ اور گہرا ہو گیا۔ برہا کی ماری کوئل نے ایک لمبی تان اڑائی تو میں نے کیکیا کر کیول کی آنکھوں میں جھانکا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جھینپ کر آنکھیں جھکا لے گی لیکن اس نے میری آنکھوں سے آنکھیں ملا کر کہا "نقوی جی! کنارے پر رہنے والے کیا جانیں کہ بھنور سے کھیلنے پر کیا بیتتی ہے۔ آپ میرے متر ہیں۔ جی چاہ رہا ہے بھید کی وہ بات آپ سے کہہ دوں جو ہونٹوں پر آ کر تڑپ رہی ہے۔"

کوئل نے دوسری تان اڑائی تو بادل کا ایک کونہ سرک گیا۔ شام کے سورج کی ایک کرن اس آم کی پھننگ کو چھو کر دور دور تک سونا بکھیرتی چلی گئی جس کے نیچے ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کرن سے عظمت اور رفعت کا ایک نظارہ ٹوٹا اور میں کانپ کر جاگ اٹھا "کیول جی! آپ کہیں۔ میں آپ کے راز کو سننے میں رہانے کے لئے تیار ہو چکا ہوں۔"

"نقوی جی! ہندو دھرم نے ان دیکھے بھگوان تک پہنچنے کے لئے کچھ سندر بت تراش لئے ہیں۔ یہ خیالی صنم ہی سہی پر آج بھی کس نے دیکھا ہے جس کی سندرتا مانے ان کا

روپ دھارن کیا۔"

"جی ہاں!"

"نوخیال کی یہ سندرتا من کے مندر میں نجانے کب سے پیتم کے روپ میں ڈھل رہی تھی۔ یہ تو میرے روئیں روئیں میں رچی ہوئی تھی۔ لیلا کے روپ میں میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو میں اُس پجاری کی طرح گھٹنوں کے بل جھک گیا جس نے اپنے من میں بسنے والی دیوی کی پہلی جھلک پالی ہو۔"

"جی!"

"لیلا کبھی میرا سپنا تھی۔ وہ دھنک کے سات رنگ بن کر میرے من میں ڈوب جایا کرتی تھی۔ اب وہ جسم اور گوشت پوست کے سانچے میں ڈھلی تو میں بھونچکارہ گیا۔ میں نے آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ نہ جانے کب مجھے یقین ہوا کہ میری تپسیا سپھل ہو گئی ہے۔ نقوی جی! اب لیلا میرے جیون کی ملہار ہے اور دیپک راگ کی ایک تان بھی۔ میں تو اپنی لگائی ہوئی آگ میں جل بھی رہا ہوں اور جل جل کر بجھ بھی رہا ہوں اور بجھ بجھ کر سلگ رہا ہوں۔" کومل نے ایک اور تان لگائی۔ بادل نے پھر سنہری کرن کو چھپا لیا تو کیول اٹھ کھڑا ہوا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں کیول کا افسانہ اس نقطۂ آغاز سے آگے نہ بڑھا البتہ کیول کے بکھرے بکھرے اشاروں سے لیلا کا سراپا میرے تخیل کے کینوس پر یوں اُبھرا جیسے کسی چینی مصور کی بنائی ہوئی تصویر ہو جس میں تفصیل سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ چند نقطوں اور خطوں میں تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ میں نے لیلا کے مکھڑے پر شیام سُندر کی سنولاہٹ دیکھی جس میں نیلے آکاش کی چھب بھی تھی۔ ماتھے پر چندن کا ٹیکا تھا کہ صبح کے تارے کی طرح چمک رہا تھا۔ آنکھیں کنول کے کٹورے تھے جن سے شبنم کا سوم رس چھلک رہا تھا۔ کومل کمر میں بید کی لچک تھی۔ امُوا کی

کچی ٹھہی جوانی کے بُور سے لدی ہوئی تھی۔ اس کی ایک پیار بھری نظر سے سانورے گالوں میں مدھم سے دیپ جل اُٹھے تھے اور کانوں کی لویں تمتما اُٹھی تھیں اور کنول نین جھک گئے تھے اور ہونٹ کانپ کر ایک سنگیت کی تھرتھراہٹ بن گئے تھے۔ اور یہ سنگیت کیول کے من میں اُتر آیا تھا۔

چھٹیاں ختم ہونے پر کیول نے کہا "نقوی جی! آپ پتا جی سے کوئی بات نہ کریں۔"

"لالہ جی میرے بزرگ ہیں میں اُن سے بات کیسے کر سکتا ہوں کیول جی!"

"میں دسمبر کی چھٹیوں میں آؤں گا تو خود پتا جی سے بات کروں گا۔"

دسمبر کی چھٹیوں میں کیول گھر نہ آیا۔

لالہ جی نے سکول کھلنے پر مجھے بتایا "تیرے متر کی سگائی کی بات کر رہا ہوں میرے ہونے والے سمدھی ـــ بڑے آڑھتی ہیں۔ سمجھو کہ ساری منڈی کے وہی مالک ہیں۔ اگر جنم پتریاں مل گئیں تو سمجھ لو وارے نیارے ہو گئے۔ بہو کے داج میں کار بھی ملے گی اور وہ کیول کو ولایت بھیجنے کا وعدہ بھی کر رہے ہیں۔" میں لالہ جی کی اس خوش خبری پر خوش نہ ہو سکا۔ میں نے منہ لٹکا لیا اور لالہ جی کچھ حیران ہو گئے۔ میں نے ذرا وقفے کے بعد کہا "لالہ جی! کیول سے بھی پوچھ لیا آپ نے؟"

"کاکا! تجھے پتہ نہیں ہندو سماج میں جیون ساتھی کی تلاش کتنی کٹھن ہوتی ہے۔ یہ تو قسمت کی بات ہے کہ جوڑ مل جائیں۔"

"پھر بھی لالہ جی......" میں اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ لالہ جی نے میری بات کاٹ کر کہا "کاکا! تو دیکھ لینا۔ کیول اس بندھن میں کتنا خوش ہوگا۔ ذرا پنڈت جی جنم پتریاں ملا لیں اور کوئی شبھ گھڑی آئے تو میں کیول کو خط لکھ دوں گا۔"

لالہ جی نے ایک شبھ گھڑی دیکھ کر کیول کو پتر لکھ دیا۔

کیول نے جواب میں نہ جانے کیا لکھا پر اُس دن لالہ جی بڑے اداس تھے۔ میں تنہائی میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "کاکا! تیرے متر کو باولے کتے نے کاٹ کھایا ہے کہ وہ گھر آئی مایا کو ٹھکرا رہا ہے۔"

"کیوں لالہ جی! کیا ہوا؟"

"اس نے سگائی سے انکار کر دیا ہے۔"

"پھر لالہ جی! انہیں اپنی پسند کا حق دے دیجیے۔"

لالہ جی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے مجھ پر ایک جلتی چبھتی نظر ڈال کر کہا "کاکا! ہندو سماج میں یہ حق ماں باپ کو پہنچتا ہے۔"

"لالہ جی! مسلم سماج کے بڑے بوڑھے بھی اس کو اپنا حق سمجھتے ہیں پر ہر سماج میں کچھ لوگ باغی بھی ہوتے ہیں۔"

"تو کاکا! میں تیرے کیول کو بغاوت نہیں کرنے دوں گا۔ دیکھ لینا وہ میری اچھیا کے آگے سر کے بل جھک جائے گا۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

امتحان سے پہلے کی چھٹیوں میں کیول آیا تو میں اُس سے ملنے گیا۔ اس دفعہ کیول میرے لئے کچھ نوٹس بھی لے آیا تھا۔ انہیں بہت زیادہ مفید پا کر میں اُن کی نقل میں جُٹ گیا اور دو چار دن بعد جب میں پھر کیول سے ملنے گیا تو نچلی سیڑھی پر لالہ جی گویا میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ اُن کی مونچھیں خوشی سے تھرتھرا رہی تھیں۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ بڑے رازدارانہ لہجے میں بولے "کاکا! کیول کی ماتا نے بڑا یدھ کیا۔ تیرا متر مان گیا ہے۔"

"کیا اُن کی سگائی ہو گئی؟"

"نہیں کاکا ابھی نہیں۔ کیول بی۔ اے پاس کر لے تو سگائی کی شبھ گھڑی دیکھی جائے گی پر ایک مرحلہ تو طے ہو گیا۔"

"تو ہندو سماج کے بڑے بوڑھوں نے اپنا حق منوا لیا۔" میں نے قدرے طنز آمیز لہجے میں کہا لیکن لالہ جی کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

چند گنی چنی سیڑھیوں کے بعد کیول کا کمرہ تھا اور کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے میں محض چند لمحوں کا وقفہ تھا لیکن میں نے ان چند لمحوں میں کیول کی بے وفائی اور لیلا کے سپنوں کے ٹوٹنے کا منظر دیکھ لیا تھا۔ کیول کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے میں بہت جزباتی ہو گیا تھا۔ ایک باغی نے لڑے بھڑے بغیر ہتھیار ڈال دئیے تھے۔ ایک کوی نے اپنی کویتا تہہ کر کے اس کے بدلے سونے کے چند سکّے قبول کر لئے تھے۔ میں نے پوری سے لدی ہوئی کچی ٹہنی کو ٹوٹتے سنا اور کوئل کا نغمہ مر گیا۔ لیلا کے ماتھے کا چندن کملا گیا تھا اور شیام سندر کی سنولائی ہوئی سندرتا ماند پڑ گئی۔

کیول سوٹ کیس میں کپڑے ٹھونس رہا تھا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور ایک پتلون تہہ کرنے لگا۔ میں نے کہا "کیول جی! یہ نوٹس بھی رکھ لیجئے۔"

"یہ پڑھ لئے آپ نے؟"

"جی! صرف پڑھے ہی نہیں، نقل بھی کر لئے۔"

"اسے کہتے ہیں سچی لگن۔ آپ اس سال ضرور بی۔ اے پاس کر لیں گے۔"

"شکریہ........ اور........ آپ؟"

"میں...." کیول کے ہونٹوں پر ایک لہر ابھری "میں.... کون جانے؟"

کیول نے سوٹ کیس کو تالہ لگا کر کہا "پتاجی نے آپ کا منہ میٹھا نہیں کرایا؟"

"نہیں...... پر اچھا ہوا آپ نے بڑوں کا کہنا مان لیا۔"

"یہ آپ اپنے دل کی بات کر رہے ہیں؟"

"کون جانے؟...... دنیا کا کوئی دھرم یہ نہیں کہتا کہ بڑوں کی اچھیا کو ٹھکرا دیا جائے۔"

"نقوی جی! آپ زخم پر نمک نہ چھڑکیں....... ممتا کے ٹھنڈے سائے تلے من کو شانتی ملتی ہے پر میں اُس نرک کا کیا کروں جو میرے ہردے میں بھٹک رہا ہے۔ میں تو جل کر راکھ ہو جاؤں گا" کیول کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ میں نے اٹھ کر جانا چاہا تو کیول نے کہا "بیٹھئے نقوی جی!" میں بیٹھ گیا۔ کیول نے رومال سے آنکھیں پونچھیں۔ پھر اُس نے لیلا کے ساتھ اپنے پریم کی کتھا خوب دل کھول کر سنائی۔ اس کتھا میں من کی آگ تھی۔ ارمانوں کے شعلے تھے۔ کوئل کی کوک تھی۔ پپیہا کی پی۔پی کا دیپک راگ تھا۔ نل اور دمینتی کا سچا پیار تھا۔ آپ بیتی میں کیول کے من کا سارا دکھ نچڑ آیا تھا اور میں نے اس کے انجام پر ایسا محسوس کیا جیسے میں دنیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہوں اور یہ دنیا کا سب سے بڑا افسانہ تھا جو مجھ پر نازل ہو رہا تھا اور میرے قلم کی چند جنبشوں میں غیر فانی ہو جائے گا۔

کیول نے کہا "جیون کی نرد کے ایک پانسے پر ممتا کا پیار ہے۔ دوسرے پر لیلا کا سچا پریم....... نجانے کونسا پانسہ ٹھیک پڑے....... رام چندر جی نے ایک بڑے آدرش کے لئے ممتا کا پیار ٹھکرا دیا تھا پر سماج نے انہیں کچھ نہ کہا۔ اس لئے کہ وہ بھگوان کے اوتار تھے۔"

"کیول جی! میں آپ کی اور مدد تو نہیں کر سکتا پر ایک وعدہ کرتا ہوں۔"

"کہئے" کیول نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

"میں کیول اور لیلا کے سچے پیار کی کہانی لکھوں گا۔ آپ امتحاں دے کر جب اگلی بار آئیں تو یہ کہانی آپ کو سناؤں گا"

"اس کہانی میں وہ آگ بھی بھر دیجئے جو میرے من میں بھڑک رہی ہے۔"

"کیوں نہیں؟" میں الہام کی ایک کیفیت سے سرشار ہو کر بولا "یہ دنیا کا سب سے بڑا افسانہ ہو گا!"

امتحان سے فارغ ہو کر میں نے کیول اور لیلا کا افسانہ لکھا۔

میں نے اس کا عنوان "رام کی لیلا" رکھا۔ یہ میرا پہلا افسانہ تھا جو ادھورا بھی تھا اور مکمل بھی کیونکہ ابھی اس کے انجام پر پردہ نہیں گرا تھا اور انجام میرے ذہن میں نقش تھا۔ اس سے پہلے میری کاپی میں صرف چند ادھورے افسانے تھے جن کا انجام مجھے کبھی نہ سوجھ سکا تھا۔

کیول اور لیلا نے مجھے افسانہ نگار بنا دیا تھا!

میرا خیال تھا کہ امتحان ختم ہونے کے فوراً بعد کیول آئے گا لیکن وہ نہ آیا۔ لالہ جی کیول کے نہ آنے پر فکر مند سے تھے۔

میں نتیجے کے انتظار میں دن گن گن کر کاٹنے لگا۔

پھر وہ دن بھی آ پہنچا۔ وہ ایک جھلسا ہوا بے انتہا گرم دن تھا۔ مجھے ہیڈ ماسٹر نے دفتر میں بلایا۔ اُن کے ہاتھ میں "ٹربیون" اخبار تھا اور میرے رول نمبر کے نیچے سرخ لکیر کھنچی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا "مبارک ہو! آپ پاس ہو گئے ہیں"۔ میں بیہوش ہو گیا یا زمین و آسمان گھوم گئے تھے یا ایک لمحہ ایسا آیا تھا کہ زمین کی گردش ختم گئی تھی۔ سرخ لکیر ایک بڑا سا دھبہ بن کر کائنات کی وسعتوں پر چھا گئی تھی .... جب مجھے ہوش آیا تو میں نے ہیڈ ماسٹر کی میز کے سامنے لالہ جی کو بیٹھے دیکھا۔ اُن کے چہرے کا رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ چکا تھا اور اُس پر بے شمار جھریوں کا جال سا تن گیا تھا۔ مونچھیں ریشم کے سفید بالوں کی طرح لرز رہی تھیں۔ اخبار اُن کے سامنے کھلا پڑا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا "لالہ جی! میرا متر کیول؟"

"وہ پاس ہو گیا ہے"۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

"لالہ جی! مبارک ہو"۔ میں نے خلوص سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "ذرا مجھے اخبار دیجیے"۔

لالہ جی نے اخبار میری طرف سرکا دیا اور ٹپ سے آنسو کا ایک قطرہ اخبار پہ گرا۔ میں حیران ہو گیا۔ میں نے دیکھا تو اخبار اردو کا تھا۔ میری حیرت میں اور بھی اضافہ ہوا۔ میں نے اُس جگہ پر نظریں جما دیں جہاں آنسوؤں کا دھبہ پڑا ہوا تھا۔ اس جگہ ہیڈ ماسٹر نے سرخ سیاہی سے تین چار لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔ میں نے دُھندلائی ہوئی آنکھوں سے پڑھا۔

"شری کیول کرشن کی شادی خانہ آبادی قلعہ گوجر سنگھ میں شری دینا ناتھ بھلّا اکاؤنٹنٹ ابورین گرین بینک کی سپتری شریمتی لیلا دیوی کے ساتھ انجام پائی۔ اس مبارک تقریب میں بینک کے مینجر اور دوسرے عملے نے شرکت کی۔"

میں سُن ہو کر رہ گیا۔

لالہ جی کی سفید مونچھیں آنسوؤں سے تر ہو چکی تھیں۔

"میں دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ ایسے کپوت دھرتی کا بوجھ ہوتے ہیں۔"

ایک عظیم افسانہ نگار کا عظیم افسانہ پھر ادھورا رہ گیا تھا۔

میں نے گھر آ کر افسانے کو نذرِ آتش کر دیا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا!

جلی ہوئی کہانی کی راکھ اُڑی اور میں بھی اُس کے ساتھ فضائے بے کراں میں آوارہ ہو گیا۔ میں نے بی۔ٹی میں داخلہ لیا۔ میں لاہور میں تھا اور کیول بھی قلعہ گوجر سنگھ کے کسی مکان میں تھا لیکن میں کیول کی تلاش میں نہ نکلا۔ نہ کیول سے میرا سامنا ہوا نہ ہی ملاقات ہو سکی۔ کئی بار میرے جی میں یہ تمنا اُبھری کہ لاہور کی کسی سڑک پر کیول سے ملاقات ہو جائے تو میں اُسے بھینچ کر کہوں "کوی مہاراج! آپ کی کویتا تو لیلا کے روپ میں

زندہ ہو گئی ہے۔ میری کہانی تو اپنی موت آپ مر گئی۔" تقدیر نے مجھے کیول کی ملاقات سے محروم ہی رکھا۔ وہ میری زندگی سے یوں خارج ہوا جیسے خزاں میں جھڑنے والا خشک پتہ ہو جو ہوا کے دوش پر سوار ہو کر کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔

پھر ہندوستان آزاد ہو گیا۔

تاریخ کا ایک عظیم باب کھلا۔ اس کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر دو قوموں نے نئی زندگی کو لبیک کہا اور پھر ایک کا ہاتھ دوسری کے گلے جا پڑا۔ وہ باب جو سنہری حرفوں سے لکھا جا رہا تھا، خون کی شفق میں ڈوب گیا۔ ابھی مطلع صاف نہ ہوا تھا کہ ایک دن ایک گندا سا لفافہ میرے نام آیا۔ اس کا چہرہ ڈاکخانے کی مہروں سے لتھڑا ہوا تھا۔ پتہ بار بار کٹا ہوا تھا۔ اِس خط کا پہنچنا بھی ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔ کیول کرشن کا نام پڑھ کر میں چونک بھی تو نہ سکا۔ نجانے کیوں؟

کیول نے لکھا تھا:۔

نقوی جی، نمستے!

آزادی کی کالی ماتا بلیدان لئے بغیر اپنی جھلک بھی نہیں دکھاتی۔ کیا آپ تاراپور میں ہیں یا کہیں اور؟ مجھے پتاجی نے ختم کر دیا تھا اور لیلا بہو بن کر تاراپور میں گئی ہی تھی کہ آگ لگ گئی۔ لیلا کے آنچل تک بھی آگ پہنچی پر وہ جل کر بھسم بھی تو نہ ہو سکی۔ آپ تاراپور میں ہوں تو اچھا۔ نہیں تو وہاں جائیں اور لیلا کا کھوج نکالیں۔

آپ کا داس
کیول کرشن

کیول کا خط پڑھ کر بھی میں چونک نہ سکا!
کچھ عجیب سی بے حسی طاری تھی مجھ پر!

میں نے کیول کے پتر کو مخاطب کر کے کہا ”کوتی مہاراج! آپ ایک لیلا کا رونا رو رہے ہیں۔ اس آگ میں لاکھوں ستی ساوتریاں جل کر بھسم ہو چکی ہیں۔ میں کس کس کو ڈھونڈتا پھروں؟“ میں تاراپور نہ جا سکا۔ میں جا کر کرتا بھی کیا؟ میں کون سا خدا کی فوجدار تھا۔ پورے تین مہینے میں خط کا جواب بھی نہ لکھ سکا۔ کئی بار میں نے لکھنے کی کوشش بھی کی۔ آخر ایک دن میں نے جی کڑا کر کے جواب لکھ ہی دیا۔ بڑا مختصر سا جواب!

کیول جی، نمستے!

آپ کا خط ملا۔ آزادی ہمیشہ قربانیاں طلب کرتی ہے۔ یہ کون سی نئی بات ہے؟ بھگوان پر وشواش رکھیں۔ دونوں طرف سے پیچھے رہ جانے والی عورتوں کو برآمد کیا جا رہا ہے۔ اگر لیلا دیوی آگ میں جل کر بھسم نہیں ہو گئیں تو آپ کے پاس ضرور پہنچ جائیں گی۔ تاراپور جانے کا کچھ فائدہ نہیں؟

آپ کا اپنا
بنے
نقوی

خط لکھ کر میں نے محسوس کیا کہ ایک بوجھ سر سے اتر گیا ہے جو تین مہینوں سے میرا گلا گھونٹ رہا تھا۔ ایک ناخوشگوار فرض ٹل گیا تھا! دو ماہ اور گذرے تو پھر میرے نام کا ایک لفافہ آیا۔ میں نے چاک کیا تو یہ خط بھی ہندوستان سے آیا تھا۔

عزیز القدر طول عمرہٗ۔ دعائے عمر درازی و ترقیٔ درجات!

کیول کے نام عزیز کا محبت نامہ ملا۔ میں نے بھی پڑھا۔ افسوس ہے کہ عزیز نے اپنے کوائفِ زندگی تفصیل سے نہیں لکھے۔

کیول کے خط سے عزیز کو پریشانی تو ضرور ہوئی ہوگی۔ کیول اپنے ہر مسلمان متر کو

اس قسم کے پتر لکھ کر پریشان کرتا رہتا ہے - نادان لڑکا -

تارا پور جانے کی ضرورت نہیں تم نے اچھا کیا کہ آپ وہاں نہیں گئے - لیلا تو یہاں ہے شاید عزیز کو معلوم نہ ہو کہ میں نے کیول کو معاف کر دیا تھا - لیلا بہو بن کر آئی تو میرے گھر کا اجالا بن گئی - قصبے کے ڈسٹرکٹ بورڈ گرلز اسکول میں اُسے استانی کی جگہ مل گئی - جب ہندوستان میں آگ لگی تو اس کی ایک لپیٹ ہماری گلی میں بھی آ پہنچی - لیلا سکول میں تھی اور سکول تھا بھی کون سا دور؟ یہی ایک فرلانگ کے فاصلہ پر اس دن یہ فرلانگ کالے کوسوں میں بدل گیا تھا - ہم افراتفری کے عالم میں گھر چھوڑ کر بھاگے تو لیلا پیچھے رہ گئی - قیامت کا عالم تھا - بھائی بھائی کو اور باپ بیٹی کو بھول گیا تھا - قصبے سے باہر کیمپ لگا - ایک رات موت اور زندگی کی کشمکش میں گزر گئی - صبح ہوئی تو قصبے کے بچے کھچے لوگ بھی کیمپ میں آ گئے - لیلا اور اس کے ساتھ گھری ہوئی ہندو اُستانیاں اور بچیاں بھی ہم سے آ ملیں -

عزیز! تم جانتے ہو کہ ڈسٹرکٹ بورڈ گرلز اسکول کے ساتھ سائیں جیون شاہ کا تکیہ ہے - لیلا اور دوسری اُستانیوں اور بچیوں نے اسی تکیے میں پناہ لی تھی - تکیے کے متولی پیر شاہجہان شاہ اُن کو ساتھ لے کر کیمپ میں آئے - انہوں نے کہا "سجنو! یہ تمہاری امانتیں ہیں - میں نے رات بھر جاگ کر ان کے لئے پہرہ دیا - سائیں جیون شاہ کے تکیے میں ان پر کوئی آنچ نہ آئی - اپنی امانتوں کو سنبھال لو!"

ہم گرتے پڑتے ہندوستان پہنچ گئے - کیول بھی لاہور سے مرتا بچتا آیا تو پورے دو مہینے بعد اس نے ہمیں ڈھونڈ لیا - میرا گھر پھر آباد ہوا تو میں پرماتما کا شکر بجا لایا - عزیز! جب بچھڑا ہوا کیول ہم سے ملا تو وہ بہت پریشان حال تھا - اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور آنکھیں لال انگارا تھیں - ایک کھٹیا پر پڑ کر بے سدھ سویا تو دو دن اور دو راتیں اسے ہوش آیا نہ اس نے کچھ کھایا پیا - جب وہ جاگا تو

اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھا جیسے وہ ہمیں پہچان رہا ہو۔ پھر اُس نے بڑبڑا کر کہا "آپ میرے پتا ہیں ۔ یہ میری ماتا ہیں ۔ پر یہ دیوی کون ہیں؟" میں نے کہا "یہ لیلا ہے کیول!"

"نہیں پتا جی! لیلا تو اُدھر ستی ہو گئی تھی ۔ اُدھر سے کوئی لیلا زندہ سلامت اِدھر نہ آسکی۔" لیلا نے یہ سنا تو اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی ۔ میں نے محسوس کر لیا کہ کیول کے ذہن پر دھند چھائی ہوئی ہے ۔ کیول بڑا حساس ہے ۔ نجانے اُس نے کتنے خونی منظر دیکھے ہیں اُسے آرام کی ضرورت ہے ۔ سکون میسر ہوا تو وہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

چھ ماہ گزر گئے ۔ میں نے ایک مقامی سکول میں نوکری کر لی ۔ لیلا کو بھی ایک سکول میں جگہ مل گئی پر کیول نے لیلا کو پہچاننے سے انکار کر دیا ۔ وہ ایک ہی رٹ لگائے چلا گیا "پتا جی! لیلا تو ستی ساوتری ہے ۔ وہ تو چتا میں جل کر راکھ ہو چکی ہے۔" قصہ مختصر ایک دن مجھے طیش آ گیا۔ میں نے کیول کو بلا کر کہا "تو دیوانہ ہو گیا ہے کیول؟ جنگل میں آگ لگ جائے تو اُس میں سے بھی کچھ پنکھ پکھیرو جانیں بچا کر نکل آتے ہیں ۔ تو میری بات پر وشواش کر۔ لیلا پر کوئی آنچ نہ آئی تھی ۔ سیتا جی راون کی قید سے نکلیں تو صبح کے تارے کی طرح پوتر تھیں!"

اب ایک سال گزر گیا ہے۔ کیول اپنے مسلمان مترّوں کو خط لکھ لکھ کر پریشان کرتا رہتا ہے۔ اب اُس نے کہنا شروع کر دیا "پتا جی! سری رام چندر جی بھگوان کے اوتار تھے اور سیتا جی کو دھرتی ماتا نے جنم دیا تھا پر جب سیتا جی راون کی قید سے نکلیں تو سری رام چندر جی کا اعتقاد بھی شکست کھا گیا تھا ۔ وہ اگنی کنڈ میں نہا کر پوتر بھی ہو گئی تھیں پر رام چندر جی کا یقین لوٹ کر نہ آیا۔ پھر دھرتی ماتا کا سینہ پھٹا اور وہ اُس کی گود میں چلی گئیں۔"

"کیول! تو اُن پرشوں کی باتیں کرتا ہے جو بھگوان کے اوتار تھے - ہم پاپی لوگ ہیں۔ تو لیلا کو اوتاروں والی کٹھالی میں ڈال کر پرکھنا چاہتا ہے"۔ لیلا نے یہ سنا تو سوکھے پتے کی طرح کانپ گئی - میں نے کہا "لیلا! تو میری بیٹی ہے پر سمجھ لے کہ آج سے تو ودھوا ہو گئی ہے - میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے"۔

عزیز خط لمبا ہو گیا ہے۔

کچھ دنوں سے میں نے کیول کو شملے کے ایک ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا ہے۔ سنا ہے کہ وہ دماغی مریضوں کا اعتماد بحال کرنے میں ماہر ہیں۔

اپنی پرارتھنا میں کیول کو یاد رکھنا عزیز!

خیر اندیش

حکیم چند ددہرا

دیا

خالد کا مکان بھی اتنا بڑا نہ تھا۔ یہی دو کمرے، ایک بیٹھک اور ایک صحن جس کے گرد چار دیواری تھی۔ لیکن ننھے خالد کو اپنا گھر ہمیشہ اس کٹیا کے مقابلے میں محل نظر آیا جس میں بوڑھا نبی بخش اور اس کی چھوٹی بیٹی شیماں رہا کرتے تھے اور جس کے کھلے آنگن میں شیشم کا ایک بڑا درخت تھا۔

خالد کا گاؤں شہر سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ خالد کا باپ کچہری میں ملازم تھا۔ پہلے وہ گاؤں کے اندر اپنے آبائی کچے مکان میں رہا کرتے تھے پھر خالد کے باپ نے گاؤں سے باہر یہ پختہ مکان تعمیر کروا لیا اور وہ اس گھر میں اٹھ آئے۔ خالد کو پہلے دن ہی سے اس مکان سے اُنس پیدا ہو گیا۔ اس کے ارد گرد دور دور تک کھلے کھیت تھے اور درختوں کے جھنڈ جہاں سارا دن پرندے چہچہاتے اور اڑتے رہتے تھے اور اس کی دیواروں کا رنگ لال تھا۔ گاؤں کے اندر کچی گلیاں تھیں اور گندے پانی کی نالیاں۔ خاص طور پر برسات کے دنوں میں تو گاؤں کے اندر کا حصہ لبلبا کیچڑ بن جاتا۔ خالد کو کیچڑ سے بہت نفرت تھی ہر قدم پہ پھسلو اور کپڑوں کا ستیاناس۔ جوتوں کا تو برا حال ہو جاتا۔ بدبودار کیچڑ میں سنے ہوئے مرد وہ چوہے سے معلوم ہونے لگتے۔

نبی بخش کی کٹیا ان کے مکان کی تعمیر سے پہلے کی بنی ہوئی تھی۔ یہ مٹی کا بنا ہوا

چھوٹا سا گھروندہ دو کوٹھڑیوں پر مشتمل تھا ۔ اس کے دالان کے گرد چار دیواری بھی نہ تھی، نبی بخش کی زمین بہت کم تھی ۔ اس لئے وہ شہر میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتا تھا ۔ وہ صبح منہ اندھیرے شہر چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا لیکن خالد کا باپ دن چڑھے گھر سے نکلتا اور شام کو سورج چھپنے سے پہلے گھر لوٹ آتا۔ کیونکہ اس کے پاس سائیکل تھی ۔

پہلی رات خالد نے بڑے چاؤ سے نئے مکان کی صاف ستھری بیٹھک میں چارپائی بچھائی ۔ وہ لالٹین روشن کرنے والا ہی تھا کہ نبی بخش کی کٹیا میں دیا جلا ۔ اس نے نہ جانے کیوں دیا سلائی کی ڈبیا تپائی پر رکھ دی اور کھڑکی کے راستے اُس دیئے پر نظر جما دی جس کی ننھی سی لو گہرے بادلوں میں لپٹے ہوئے تارے کی مانند کپکپا رہی تھی ۔ خالد کو یہ منظر عجیب سا لگا ۔ اماں کی سنائی ہوئی داستانوں کا طلسماتی منظر جیسے وہ الف لیلے کے کسی مسافر شہزادے کی طرح لق و دق بیابانوں میں راستہ بھول گیا ہو اور یہ ننھی سی لو کانپ کانپ کر اس سے کہہ رہی ہو "بھٹکے ہوئے ننھے مسافر شہزادے ادھر آ، میں تجھے راستہ دکھاؤں"۔ خالد دیر تک کھڑکی کے سامنے رہا ۔ اس کی نگاہیں باہر کے اندھیرے کو جو شیشم کے سائے کے ساتھ مل کر اور زیادہ گہرا ہو گیا تھا، ایک پل تصور کر کے دیئے تک پہنچ رہی تھیں یا محض ایک خلا جو دیئے کی لو اور اس کی مسحور نگاہوں کے درمیان حائل ہو کر رہ گیا تھا ۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے اور وہ دیا کہاں جل رہا ہے ۔ اُسے صرف اندھیرے کے تو بر تو پردوں میں ٹمٹماتی ہوئی لو کا احساس تھا جو اب آسمان اور زمین کے درمیان ٹنگی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ یکایک لو جھلملائی اور بجھ گئی اور خالد کو دھچکا سا لگا ۔ چند لحظوں کے لئے وہ اندھیروں میں گم رہا ۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی دنیا میں لوٹ آیا ۔ اس نے دیا سلائی رگڑی ۔ لالٹین جلائی کھڑکی بند کی

اور چارپائی پر بیٹھ کر سکول کا کام کرنے لگا۔ کام ختم کر کے اس نے لالٹین گل کی اور گہری نیند سو گیا۔ صبح تک رات کی پر اسرار روشنی اسے یاد تک نہ رہی لیکن اس کے تخیل میں اتنا سا احساس ضرور باقی رہا کہ وہ لال محل کا رہنے والا شہزادہ ہے اور اس کے بلند محل کی دیواروں کے سائے میں شیما کی کٹیا ہے۔ جہاں کل رات اس کی صحرانوردی وہاں لے گئی تھی۔ شاید یہ بھی الف لیلوی خوابوں کا ایک کرشمہ تھا۔

اس دن مدرسے سے واپسی کے وقت وہ راستے میں نذیر اور بشیر کے ساتھ گیند بلا کھیلنے کے بھی نہ رکا۔ وہ سیدھا بیٹھک میں پہنچا اور بستہ الماری میں رکھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ باہر کا نظارہ بے حد دلفریب تھا۔ فروری کے مہینے کی سپہر تھی۔ سنہری دھوپ۔ گندم کے سرسبز کھیت۔ درختوں پر پھوٹنے والی ہری ہری کونپلیں۔ نیلا آسمان، اڑتے ہوئے پرندے۔ کھڑکی میں سے یہ منظر کتنا بھلا لگ رہا تھا۔ حالانکہ وہ اسکول سے واپسی کے وقت راستے میں انہی کھیتوں میں سے گزر کر آیا تھا۔ یہی سنہری دھوپ تھی۔ یہی دھلا دھلا سا نیلا آسمان تھا لیکن کمرے میں آکر یہ منظر اگرچہ بدلا تو نہیں تھا۔ لیکن اس میں عجیب معنی پیدا ہو گئے تھے۔ اور پھر ...... اس منظر میں نبی بخش کا گھروندا بھی تو کچھ عجیب سا لگ رہا تھا...... وہ دیر تک اس منظر میں کھویا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ نبی بخش کی کٹیا پہلے اسے خالی نظر آئی۔ پھر اس نے غور سے دیکھا تو دالان کے ایک کونے میں شیما نظر آئی۔ جو چولہے کی آگ بھڑکانے کے لئے پھونکیں مار رہی تھی۔ اس نے شیما کو پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا لیکن وہ شیما کے پاس سے یوں گزر جاتا ہے۔ جیسے وہ کوئی گرا پڑا پتہ ہو اور آج بھی شیما اس کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکی۔ حالانکہ اس نے دھوئیں سے بھری ہوئی آنکھوں

سے اسے دیکھا اور دیکھ کر مسکرائی۔ ننھے خالد کو یہ مسکراہٹ بھی کچھ بھلی معلوم نہ ہوئی۔ میلے چیکٹ کپڑوں کی گٹھڑی بنی ہوئی مریل سی شیماں کی اس بیمار سی مسکراہٹ میں کوئی کشش نہ تھی۔ "ہوں۔" اس نے قدم بڑھاتے ہوئے سوچا۔ "میں شیما کے ساتھ کیوں کھیلوں؟ مجھے شیما سے کیا غرض؟" اور واقعی شیما اس قابل کہاں تھی کہ خالد اسے منہ لگاتا۔ وہ خالد جو ہمیشہ دھلے ہوئے صاف کپڑے پہنتا اور جس کے بالوں میں صبح سویرے اس کی امی کنگھی کرتیں۔ اور جو لال محل کا رہنے والا شہزادہ تھا۔ وہ شیما کی کٹیا میں کیسے آتا۔ بھلا شیما سے کھیلنے کے لئے! خالد بڑی بے نیازی کے ساتھ جھونپڑے کے پاس سے گزر گیا۔ شیما پھر چولہے کے دھوئیں میں الجھ گئی اور اس کی آنکھیں دھوئیں سے بھر گئیں۔ اور ان سے گدلا سا پانی بہنے لگا۔

نذیر اور بشیر کے ساتھ خالد دیر تک گیند بلا کھیلتا رہا۔ حتیٰ کہ شام پڑ گئی اور مغربی افق پہ لٹکے ہوئے بادل لال لال پردے بن گئے۔ اور پرندے بیتاب ہو ہو کر اپنے آشیانوں کی طرف اڑنے لگے۔ اور خالد کے دل میں بے قراری کی ایک تند لہر اٹھی۔ اس نے آخری گیند پھینکی اور کہا۔ "میں اب جاتا ہوں۔"

"کیوں ابھی سے؟" نذیر نے ہٹ لگا کر کہا۔ "اب میری باری ہے۔"

"دیکھتے نہیں ہو شام پڑ گئی ہے۔" خالد نے تیز تیز کہا۔

"لیکن تم ہمیشہ دوسرے کی باری پر بھاگ جایا کرتے ہو۔ نہ بھائی ہم تو نہ جانے دیں گے۔" نذیر نے چمک کر کہا۔

بشیر نے بھی نذیر کی حمایت میں ٹھنک کر کہا —— "خالد بھائی اپنی باری دے کر جاؤ۔" خالد نے مجبور ہو کر دو تین گیندیں پھینکیں۔ نذیر نے بڑھ بڑھ کر ہٹیں

لگا میں۔ گیند پاس ہی گندم کے کھیت میں گر گئی ۔ خالد نے گھبرا کر کہا۔

"اب کیا ہو گا ؟" نذیر نے فاتحانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ "گیند تلاش کر لو۔ کون سی دیر لگے گی ۔" خالد نے مغرب کی طرف دیکھا۔ اب تو لال لال بادل بھی کالے پڑتے جا رہے تھے ۔ اور اس کے سینے کا طوفان لحظہ بہ لحظہ پُرشور بنتا چلا گیا۔ اور رات تیزی سے بڑھنے اور تاریکیاں چھانے لگیں۔ خالد کو محسوس ہو رہا تھا کہ گزرنے والا ایک ایک لمحہ اسے انجانی مسرت سے دور لئے جا رہا ہے ۔ اس نے گھبرا کر گندم کے پودوں کو الٹ پلٹ کیا، کچھ پودے اس کے پاؤں تلے مسلے گئے ۔ گھبراہٹ کے مارے وہ یکسوئی کے ساتھ تلاش بھی نہ کر سکتا تھا۔ آخر اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ۔ "نذیر بھائی ۔ بشیر بھائی ! تم ہی تو میری کچھ مدد کرو ۔"

"نہیں خالد ! ہم نہیں آئیں گے، تم اپنی باری کا کام خود کرو ۔" خالد نے مغرب کی طرف ایک بار پھر دیکھا ۔ بادل کا آخری ٹکڑا ابھی بڑھتی ہوئی تاریکیوں میں جذب ہو چکا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا ۔ اور اس کے آنسو آتے آتے رُک گئے اس نے گیند اٹھائی اور نذیر کی طرف پھینک دی ۔ "یہ لو، اب مجھے جانے دو۔" نذیر نے اپنی گیند لی ۔ اور خالد کو بُلاوا دیتے ہوئے کہا ۔ "اب جاؤ لیکن یاد رکھو خالد بھائی کل تمہاری باری ہے گیند پھینکنے کی ۔"

"اچھا ۔" خالد نے بات اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ۔ اور وہ اپنے گھر کی طرف اس تیزی سے بھاگا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو ۔ اس نے نشیما کی کٹیا کی طرف کھلنے والے پٹ کھولے اور خالد اور نشیماں کے گھر کے درمیان تاریکیوں کے بیچ اور پُراسرار خلا معلق ہو گئے ۔ صحرا نورد مسافر راستہ بھول گیا ۔

پھر شیماں کے گھر دیا ٹمٹمایا ۔ ننھی سی لَو تھرتھرائی، کانپی اور اندھیروں میں مدھم روشنی کے کپکپاتے ہوئے اشارے رقص کرنے لگے ۔ جیسے کہہ رہے ہوں ۔ " آؤ ۔ آؤ ننھے مسافر ہم تمہاری راہنمائی کے لئے حاضر ہیں ۔" خالد تخیل کی وادیوں میں آوارہ ہو کر اس ننھی سی لَو تک جا پہنچا اور دیر تک کہانیوں کے طلسماتی ویرانوں میں گم رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دیا پھر بجھ گیا ۔ پھر آہستہ آہستہ تاریکیوں کا پُل اُس کے اور شیماں کے گھر کے درمیان حائل ہو گیا ۔

اس کی اماں نے باورچی خانے سے پکار کر کہا ۔" خالد بیٹا ! آؤ کھانا کھا لو ۔" کھانا کھانے کے بعد اس نے لالٹین روشن کر کے تپائی پر رکھی اور اسکول کا کام کرنے لگا ۔ کام کر کے سو گیا اور آج رات بھی اس کی نیند اتنی ہی گہری تھی جتنی کل رات تھی ۔

اگلی سہ پہر کو اس نے کھڑکی میں سے سنہری دھوپ، نیلے آسمان اور کھلے کھیتوں کا نظارہ کیا ۔ تب گیند بلا کھیلنے کے لئے شیماں کی کٹیا کے پاس سے گزرتے ہوئے پھر اس نے شیماں کو چولہے میں پھونکیں مارتے دیکھا ۔ پھر شیماں اسے دیکھ کر مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو ۔" آؤ خالد ! میں سارا دن اکیلی رہتی ہوں ۔ میرے پاس آکر کوئی بھی نہیں کھیلتا ۔ تم ایک دو گھڑی کے لئے میرے پاس آجاؤ تو کیا حرج ہے ؟" لیکن خالد بے نیازی سے اس کے پاس سے گزر گیا ۔ محلوں میں رہنے والے شہزادے جھونپڑوں میں جا کر میلی کچیلی لڑکیوں سے نہیں کھیلتے ۔ ہاں اگر لق ودق جنگلوں میں شکار کرتے وقت راستہ بھول جائیں ۔ تو دیئے کی ننھی سی لَو سے راہنمائی حاصل کرنے کی کے لئے وہ فقیر کی کٹیا کو بھی اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کر دیتے ہیں ۔ اور اس وقت تو نکھری ہوئی دھوپ تھی اور راستہ بھولنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ لیکن شام کے بعد جب بے چاند کی رات

کے اندھیاروں کا سیلاب اُمڈا تو خالد پھر تخیّل کی وادیوں میں کھو گیا۔ اور دیئے کی مدھم لَو کا سہارا لے کر شیاما کی کٹیا میں جا پہنچا اور دیر تک الف لیلوی داستانوں کا ہیرو شہزادہ بنا رہا۔

آہستہ آہستہ بے چاند کی اندھیری راتیں ختم ہو گئیں۔ مہینے کی پہلی رات کا چاند سرِ شام نکل کر ڈوب گیا۔ دیا جلنے سے پہلے پہلے اس کی مدھم مدھم روشنی تاریکیوں کے پردے میں جذب ہو گئی۔ اور خالد کو دیئے کی کپکپاتی لَو کے ساتھ چند لمحے کی محویت کا موقع مل ہی گیا۔ لیکن دوسری رات چاند دیر تک زرد روشنی کے ساتھ آسمان کی بلندیوں پر مسکراتا رہا۔ اور اس رات تاریکیوں کے خلا نہ بنے اور تخیل کے طلسماتی ہیولے نہ اُبھرے اور دیئے کی مدھم لَو کی روشنی میں گویا گم ہو کر رہ گئی۔ خالد کو بے حد افسوس ہوا جیسے اس کے لبوں تک شہد کا بھرا ہوا پیالہ پہنچا لیکن چھین لیا گیا۔ خالد دیر تک چاند کے ڈوبنے کا انتظار کرتا رہا اور آخر چاند ڈوب گیا اور اس کے ساتھ ہی دیا بھی گل ہو گیا۔ خالد کے دل پر کھٹ سے ایک بوجھ آ گرا۔ آہ! آج وہ مسرت کہاں گئی جو ہر رات اس کے تخیّل کو لرزتی ہوئی روشنیوں سے آباد کیا کرتی تھی۔

تیسری رات چاند اور شوخ ہو گیا۔ اور تب چاند سورج کے ڈوبنے کا بھی انتظار نہ کرتا۔ مغرب میں سورج کا لال لال گولہ ابھی تیر ہی رہا ہوتا کہ مشرق کا دامن گلنار ہو جاتا اور چاند کا طلائی قرص اُبھر آتا اور رات زرد نقرئی روشنیوں سے منور ہو جاتی۔ شیاما کی کٹیا میں ہر رات دیئے کی مدھم روشنی اُبھرتی لیکن شیشم کے سایوں سے آگے نہ بڑھ سکتی اور خالد پہلی دو تین راتوں اداس ہوتا رہا۔ پھر اس کی کھلنڈری یادوں کے ہیولے مٹ گئے۔ اور اس کی زندگی کا یہ نیا رومان پرانے معمول کے چکر میں پس کر رہ گیا

اب وہ رات گئے تک گیند بلّا کھیلتا رہتا ۔ موسم بہار کی خنکیاں اور خوشبو میں چھٹکی ہوئی چاندنی ہیں گھل مل جائیں اور خالد کو گیند بلّا کھیلنے بے انتہا لطف محسوس ہوتا۔ لیکن لیل و نہار کی گردش پھر چاندنیوں کے سیلاب سے گھپ اندھیرے کے امڈے ہوئے گھیرے بادلوں کی طرف لوٹ آئی - خالد کی یادوں میں پھر مدھم لَو کے کپکپانے بھرے جادو بھرے اشارے ناچے اور وہ تیرہ چودہ دنوں کے بعد پھر کھڑکی کھول کر دیئے کے جلنے کا انتظار کرنے لگا اور لق و دق ویرانوں کی بے کراں پہنائیوں میں کھو جانے کے لئے بیتاب ہو گیا۔ لیکن دیر تک اندھیروں کے خلا میں وہ ننھی سی روشنی نہ ابھری اور خالد کا انتظار برف کے گالوں کی طرح اس کے سینے پر گرنے اور بوجھ بننے لگا - اور وہ لمحہ دور چلا جاتا جس کو پکڑنے کے لئے اس کی تخیّل کی ہر قوت برق رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔

آخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا - وہ اٹھا اور پھر بے خیالی کے عالم میں شیما کے گھر کی طرف ہو لیا - شیماں کے گھر گھُپ اندھیرا تھا - اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر کہا۔

"شیماں ..... آج ..... آج دیا کیوں نہیں جلایا ؟"

"کون ہے ؟" نبی بخش نے پوچھا ۔

"میں ہوں .... خالد .... میں دیر سے دیئے کے روشن ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔"

"کیوں ؟" اندھیرے میں شیماں کی آواز ابھری۔ "دیا ....."

"بیٹی شیماں ! دیا جلادو ..... تیل ختم ہے خالد میاں .... دیا کیسے جلے ؟

لیکن تم دیا جلنے کا انتظار کیوں کرتے ہو۔" نبی بخش نے پوچھا۔

خالد نے سوچا وہ دیا جلنے کا انتظار کیوں کرتا ہے۔ اسے دیر تک کوئی جواب نہ سوجھا، پھر اس نے دھیمے سے بڑبڑا کر کہا۔" میں مسافر شہزادہ ہوں جو ہر اندھیری رات کو راستہ بھول جاتا ہے۔ تمہارا دیا ہر رات مجھے راستے پر لگاتا ہے۔" نبی بخش کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے اندھیرے میں خالد کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پھر اس نے کہا "خالد میاں..... شیماں کو بخار ہے..... وہ آج دیئے میں ڈالنے کے لئے تیل نہ لا سکی۔ تم جاؤ میں ابھی تیل ڈلوائے لاتا ہوں۔ شام کے وقت دیا ضرور جلنا چاہیئے۔"

نبی بخش دیا ہاتھ میں لے کر گاؤں کی طرف چل دیا۔ خالد دوڑ کر واپس آیا۔ وہ کھلی کھڑکی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ اندھیروں میں تخیّل کے ویرانے ابھرے۔ بے آب و گیاہ ریگستانوں کے ہیولے ابھرے۔ شیماں کے گھر تک اندھیروں کے پل بنے اور خالد ننھے شہزادے کی گم کردہ موہوم ہستی میں گم ہو گیا۔ کچھ دیر بعد دیا جلا۔ سرخ روشنی کا نقطہ کانپا اور ننھے مسافر کو اپنا راستہ مل گیا۔

ہر شام دیا جلتا رہا اور خالد ہر سہ پہر کو بلّا ہاتھ میں لے کر شیماں کے گھر کے پاس سے گزرتا رہا۔ وہ شیماں کے صحن کی طرف محض ایک نگاہِ غلط انداز ڈال دینا ہی کافی سمجھتا تھا۔ اسے شیماں کی ہستی سے کیا مطلب؟ اسے تو محض شیماں کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے کی روشنی سے پیار تھا۔ اگرچہ دو تین دن سے اسے شیماں چولہے کے دھوئیں کے الجھی ہوئی نظر بھی نہ آئی۔ لیکن ہر شام دیا جلتا رہا۔ اس لئے اس نے شیما کی عدم موجودگی کو قابلِ اعتنا بھی نہ سمجھا۔ لیکن ایک شام جب دیر تک شیما کا دیا روشن نہ ہوا تو رنگ محل کا شہزادہ پھر بے قرار ہو کر شیما کی کٹیا میں پہنچ گیا۔ اس نے دروازے

کے قریب کھڑے ہو کر کہا۔ "بابا آج پھر دیا نہیں جلا"۔

اندر سے نبی بخش نہ بولا البتہ ایک کمزور کانپتی ہوئی آواز نے کہا۔ "خالد بابو! آج پھر دیئے میں تیل ختم ہے۔" خالد ایک دو لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"بابا کہاں ہے؟"

"نجانے کہاں ہے"۔ شیما نے کہا۔ "وہ تو ابھی لوٹ کر ہی نہیں آیا"۔

"دیا کہاں ہے؟" خالد نے بے قرار ہو کر کہا۔

سامنے کی دیوار کے طاقچے میں۔"

"دیا مجھے دو شیما! میں تیل ڈال دوں۔"

"خالد بابو! میں تو بہت بیمار ہوں۔ میں اٹھ نہیں سکتی۔ تم خود لے لو۔"

خالد اندھیرے میں آگے بڑھا۔ اس نے ٹٹول ٹٹول کر طاقچہ تلاش کیا۔ دیا ہاتھ میں لے کر وہ بھاگا اور دکان سے تیل ڈلوا کر بھاگتا ہوا واپس آیا۔

"یہ لو شیما۔"

"اسے جلا دو خالد بابو؟"

"نہیں۔ نہیں۔" خالد نے گھبرا کر کہا۔ "ابھی نہیں۔ میں دیا تمہارے سرہانے فرش پر رکھ دیتا ہوں۔ میرے گھر پہنچنے سے پہلے پہلے دیا نہ جلے۔"

"ڈبیا بھی تو دیتے جاؤ۔ اسی طاقچے میں پڑی ہے۔"

خالد نے طاقچے سے ڈبیا تلاش کر کے شیما کے ہاتھ میں تھمائی اور دوڑ کر بیٹھک میں پہنچ گیا۔ اس نے کھٹ سے کھڑکی کھولی۔ شیما نے دیا سلائی رگڑی۔ دیا سلائی کا ننھا سا شعلہ ابھر کر دیئے کی لو کے ساتھ مل گیا۔ لو آہستہ آہستہ بلند ہوئی اور اندھیروں کو چیرتی

ہوئی اس تک پہنچ گئی - اور خالد نے طلسماتی مسرت کا خزانہ پالیا۔

لیکن اس سے اگلے دن جب پھر وقت مقررہ پر دیئے میں بتی نہ پڑی تو خالد کچھ مایوس اور کچھ ناراض ہو کر شیما کی کٹیا میں جا پہنچا وہ پھر دروازے سے باہر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ابھی نبی بخش کو 'بابا' کہہ کر پکارا ابھی نہ تھا کہ شیما کی مریل سی آواز آئی - "بابا خالد بابو دیئے کے جلنے کا انتظار کر رہے ہوں گے - تم دیا کیوں نہیں جلاتے ؟ "

"دیئے میں تیل کل ختم ہے بیٹی ۔"

"میں تیل ڈلوا لاؤں بابا ؟" خالد نے پکار کر کہا۔

"بابا ! خالد بابو آ گئے ۔" شیما کی دھیمی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی ۔ "خالد بابو کل ہی تو تیل ڈلوا کر لائے تھے ۔ بابا ! کل تم دیر سے آئے ۔ میں نے خود ہی دیا جلایا اور بجھا دیا ۔"

"خالد میاں !" نبی بخش نے کہا "تم جاؤ ۔ میں ابھی دیا جلاتا ہوں ۔"

پر اسرار وادیوں میں ہر رات راہ گم کر دینے والا شہزادہ دوڑ کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ دیا جلا ۔ خوابوں کا قافلہ روانہ ہوا ۔ دیا ٹمٹمایا اور چند لمحوں بعد نہ جانے کیوں کپکپا کر بجھ گیا۔ خالد کا پُر اسرار خواب پریشان ہو گیا ۔ مسرت کا خزانہ ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گیا ۔ وہ چند لمحوں تک تاریکیوں کے خواب میں الجھا رہا ۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی دنیا میں لوٹ آیا ۔ دوسرا دن مسکراتا ہوا پیدا ہوا ۔ بے داغ نیلا آسمان سارا دن نقرئی دھوپ میں نہاتا رہا ۔ سہ پہر کو سنہری دھول بکھری اور گندم کے ہرے ہرے کھیتوں پر سونے کی بارش ہوتی رہی ۔ پھر شام ہوئی ۔ مغرب کے دامن میں گلاب کے پھول کھلے اور اندھیروں کے بے پناہ سیلاب میں راکھ بن کر تحلیل ہو گئے ۔ اور ننھا خالد پھر کھڑکی کھول کر مٹی کے اس دیئے کے روشن ہونے کا انتظار کرنے لگا جو چند لمحوں کے لئے الف لیلوی داستانوں

کا ازلی اور ابدی حسن بن جایا کرتا تھا۔

شیماں کا دیا روشن نہ ہوا۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ بن گیا۔ آخر خالد اٹھا اور شیماں کی کٹیا کی طرف بڑھا۔ وہ دروازے کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا۔ چاروں کھونٹ گہری خاموشیوں کا راج تھا۔ کٹیا کے اندر بھی گہرا سکوت تھا۔ خالد خاموشیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر رہ گیا۔ اور اس کی زبان پر جیسے تالے پڑ گئے۔ نجانے کب اور کتنے عرصے کے بعد اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ " شیماں "! اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ خاموشیوں کا اتھاہ سمندر اس کے دل میں اتر آیا۔ اس کا دل اس بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی عفریتی ہاتھ اس کے دل کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "شیماں!" لیکن شیماں نہ بولی۔ اس کی پشت کی طرف سے کسی نے اچانک کہا۔ " خالد میاں" آج پھر شیماں نے دیا روشن نہیں کیا۔" خالد چونک کر ڈر گیا۔ پھر اس نے کہا "ہاں بابا!"

" شیماں بیٹی! خالد میاں دیئے کے جلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔" لیکن شیماں کا کوئی جواب نہ آیا۔ نبی بخش نے کہا "خالد میاں جاؤ میں ابھی دیا جلاتا ہوں۔" خالد پلٹا۔ اس نے ایک قدم اٹھایا لیکن دوسرا نہ اٹھا سکا۔ نبی بخش نے چیخ کر کہا۔" یہ دیا تو ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا خالد میاں۔" نبی بخش کی چیخ اس کے جسم کو چیر کر گزر گئی۔ اس کا حواس کا دیا گل ہو گیا۔ وہ اندھیروں میں جذب ہوا اور پھر دیر تک ابھر نہ سکا۔ نہ اندھیرے چھٹے۔ نہ خالد کے دل و دماغ کو روشنی ملی لیکن وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ پہلے اس نے بیٹھک کا رخ کیا۔ پھر وہ یکایک پلٹا اور باورچی خانہ میں چلا گیا۔ اماں نے کہا "کھانا کھا لو خالد، اب تم بہت دیر تک کھیلتے رہتے ہو۔ اچھے بچے شام ہونے سے پہلے گھر آ جایا کرتے ہیں۔" خالد نے ایک لقمہ توڑا لیکن وہ اس کے حلق سے نہ اتر سکا۔ اس نے

پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ اماں نے کہا۔" خالد تمہارا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے، اندھیرے میں ڈر گئے ننھے کیا۔" خالد نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس کے کستے ہوئے چہرے کا ایک ایک نقش پھیکا پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اماں نے حیران ہو کر پوچھا "تم رو کیوں رہے ہو خالد ؟"

" اماں ۔" خالد نے سسکیوں میں الجھی ہوئی آواز میں کہا۔" آج شیماں کا دیا گل ہو گیا ....."

چار ناول
جو اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں

وداعِ بہاراں

دل گداز و دل نشیں اسلوب تحریر پر مشتمل
عابدہ نرجس کا ایک فن کارانہ مرقع ۔ ۱۲/-

جو مجھے دیکھا تنہا

صاحب طرز خاتون داستان طراز سلمیٰ اعوان
کے قلم سے ایک خوب صورت ناول ۱۴/-

دلآویز

دلآویز جس کا نام اور کردار دونوں دلآویز
تھے، ایک کیریکٹر جسے مدتوں یاد رکھا جائے گا
نگار زریں کا اچھوتا اور دلآویز ناول

دل کے صحرا میں

یاسمین صوفی کا قلم ایک بار پھر خلوص،
متانت، درد اور رومان کی کہانی رقم
کرتا ہے۔ ۱۲/-

مکتبہ عالیہ ، ایبک روڈ ، لاہور

غزل میں عورتوں سے باتیں کرنے کی روایت خوب سہی
لیکن آج کی غزل تو پوری زندگی سے مخاطب ہے

"گفتگو"

قتیل شفائی کی ان غزلوں کا خوب صورت انتخاب ہے
جن میں زندگی کی سچائیاں پوری طرح جلوہ گر ہیں۔

گاتی گنگناتی سچائیاں

تڑپتی بلکتی سچائیاں

قتیل شفائی

خیالی حسیناؤں، فرضی محبتوں اور جھوٹی وفاؤں کی باتیں نہیں کرتا
اس کا مشاہدہ سچ بولتا ہے۔ اس کی غزل نے بدن کو اپنایا ہے لیکن
بدن کو پیٹ سے الگ نہیں کیا۔ "گفتگو" اس کا ثبوت ہے۔

مکتبۂ عالیہ ــــ ایبک روڈ ــــ لاہور